سمے لائبریری

زندگی کے موڑ پر

افسانے

کرشن چندر

نیا ادارہ

15/00

زندگی کے موڑ پر

زِندگی کے موڑ پر

کرشن چندر

نیا ادارہ • لاہور

جملہ حقوق محفوظ

ناشر: نذیر احمد چوہدری
نیا ادارہ ، لاہور

آگہی کے نام

جواب اِس دنیا میں نہیں

پیش لفظ

'زندگی کے موڑ پر' تین طویل افسانوں پر مشتمل ہے۔ 'زندگی کے موڑ پر'، 'گرجن کی ایک شام' اور 'بالکونی'۔۔۔۔ ان افسانوں کا مرکزی موضوع انسانی محبت ہے۔

'زندگی کے موڑ پر' میرا پہلا طویل مختصر افسانہ ہے، اور شاید اب بھی مجھے یہ اپنے تمام افسانوں میں سب سے زیادہ پسند ہے۔ اس میں وسطی پنجاب کے ایک قصبہ کا مرقع پیش کیا گیا ہے، اور اس قصباتی پس منظر کو لیکر شادی، براہمنی نظام زندگی، عشق کی خودکشی اور ان سے متعلق مسائل سے پیدا ہونے والے فکری اور جذباتی ماحول کی آئینہ داری کی گئی ہے۔ جہاں تک ان مسائل سے پیدا ہونے والی فکری اور ذہنی الجھنوں کا تعلق ہے۔ آپ اُنکی نفسیاتی تشریح کی ایک واضح صورت اس کہانی میں دیکھیں گے لیکن راہِ نجات ابھی بہت دُور ہے۔

'گرجن کی ایک شام' ایسے علاقے سے تعلق رکھتی ہے جو موجودہ تہذیب کی ایک بہت بڑی نشاط گاہ (گلمرگ) سے چند قدم کے فاصلہ پر ہے، لیکن ان دونوں مقامات میں کس قدر فرق ہے، یہ آپ کو اس کہانی سے اور اس سے اگلی کہانی 'بالکونی' کے مطالعہ سے معلوم ہو جائیگا۔ یہ چند قدم ہیں لیکن ان میں ہزاروں سالوں کا بُعد ہے۔ 'گرجن کی ایک شام

قبائلی زندگی اور قبائلی زندگی میں محبت کی داستان پیش کرتی ہے، ایسے مقامات اب ہندوستان میں معدوم ہوتے جارہے ہیں، 'گرجن کی ایک شام' کو آپ ایک جزیرہ سمجھیے، جہاں سرمایہ دارانہ تہذیب کی روشنی ابھی تک نہیں پہنچی، سچی محبت جو جماعتی تضاد سے بالاتر ہو، اِس جزیرے میں پنپ سکتی ہے، لیکن افسوس یہ ہے۔ کہ 'گرجن کی شام' ایک چھوٹا سا جزیرہ ہی تو ہے، اور جب محبت اِس جزیرے سے نکل کر کسی برِ اعظم کی وسعتوں میں آنا چاہے تو ـــــ ؟

'بالکونی' اِس مجموعے کی آخری کہانی ہے۔ اِس میں گلمرگ کے ایک ہوٹل کا ذکر ہے۔ اس ہوٹل کے کمروں میں اور اُن کے بسنے والوں میں آپ اپنی ملکی زندگی کا حیرت انگیز تنوع دیکھ سکیں گے۔ سیاست جس کی اساس نفرت پر قائم ہے۔ محبت جس کا دائرہ اس درجہ محدود اور جس کا تاثر اس قدر وقتی ہے، کہ اُسکی صورت پہچانی نہیں جاتی۔ کردار محبت کے اس غیر مربوط اور بے آہنگ رشتے سے اُکتا کر راہِ فرار تلاش کرنے آئے ہیں، لیکن کیا کوئی راہِ فرار ممکن ہے، یہاں پہنچ کر ذہن مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی منفیت کو ترک کر کے کوئی راہِ ثبات تلاش کرے۔

یہ افسانے مختلف موقعوں پر لمبے لمبے وقفوں کے بعد لکھے گئے، ان کا ذہنی ربط اور آہنگ کسی ارادیت کا نتیجہ نہیں، اسے لاشعور کی تخلیقی قوت سمجھیے یا محض اتفاق کہ یہ تینوں طویل مختصر افسانے ہیں، محبت ان کا مرکزی موضوع ہے۔ اور یہ محبت کے متعلق انسانی نظریے کے تدریجی ارتقا کو ظاہر کرتے ہیں۔

کرشن چندر

۲/۷۔ تلک روڈ پونا
اکتوبر ۴۳ء

زندگی کے موڑ پر.......

"منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی"

اقبالؔ

مُسافر

پرکاش وتی کا بیاہ تھا اور سوشیلا اور لیلا بیاہ دیکھنے کی خوشی میں نئے نئے کپڑے سلوا رہی تھیں، جارجٹ کی سبز ساڑھی اور زری کا فیتہ، نیلون کا بادامی دوپٹہ اور اس کا جھلملاتا ہوا انقرئی کنارہ، آنکھ کے نشے کی قمیص اور امرت منتھن کی شلواریں، عجیب عجیب سے بلوز جو دور سے دیکھنے میں ایسے معلوم ہوں گویا چائے دانی کو ڈھانپنے کے ہی کام آسکتے ہیں، لیکن جب سوشیلا اور لیلا انہیں پہن لیں تو گول، گول قطع کئے ہوئے کناروں سے بازو ایسے نکل آئیں جیسے سیب کی شاخیں پھولوں کے بار سے جھک رہی ہوں۔ بچارا پرکاش چند سوشیلا اور لیلا کی طرف دیکھ دیکھ کر سوچتا کہ عورتیں بھی عجیب مصیبت ہیں۔ یہ پیدا ہوں تو بھی مصیبت اور نہ پیدا

ہوں تب بھی مصیبت، لیلا نے نئے طلائی آویزے خرید لئے تھے، اور سوشیلا نے بلّی کے پنجوں کی طرح اپنے ناخن بڑھا لئے تھے، اور ہر روز انہیں پالش کیا کرتی تھی، اور سوچتی کہ جب سری پور جائیں گے تو سوشیلا کے طلائی آویزوں کو کون پوچھے گا، ہاں، اُس چھوٹے سے قصبے کی سب لڑکیاں اُس کے سپید سپید لمبے ناخنوں کو دیکھ کر ضرور حیران ہوں گی، اری یہ کیا ہے؟ دیکھ تو بہن یہ لاہور کا نیا فیشن ہے، کیا تجھے خبر نہیں سوشیلا اب کالج میں پڑھتی ہے، ہاں کالج میں، اور پھر کیسی کیسی عجیب باتیں ہونگی، خوب لطف آئے گا اُن کی باتیں سُن کر، اور لیلا نے تو جب سے "پریم کی پکار" میں ہیروئین کے کانوں میں نئی وضع کے آویزے دیکھے تھے، اُس کا دل للچا رہا تھا، اب پر کاش وتی کے بیاہ پر یہ موقع ملا تھا کہ وہ ان طلائی آویزوں کا تقاضا کرتی، اور یہ تو سب جانتے ہیں کہ آویزے جتنے لیلا کے کانوں میں بھلے معلوم ہوتے ہیں اور کسی کے کانوں میں نہیں ہوتے، اور پھر یہ آویزے بھی تو بہت اچھے تھے۔ لمبے لمبے سے، ایک چھوٹے سے طلائی گنبد کے نیچے ایک اُس سے ذرا بڑا طلائی گنبد تھی کہ یہ طلائی گنبد ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے اُس کی سپید بلوریں گردن تک پہنچ جاتے تھے، یہ آویزے بالکل ایسے تھے جیسے مدرا کے مندر لٹکے ہوئے لہرا رہے ہوں اور جب آئینے کے سامنے وہ گردن ایک

طرف جھکا کر مسکرا دیتی، تو اس کا ہنسنا، اور طلائی گنبدوں کا جھومنا، اور اُس کے گالوں کا شہابی ہو جانا، یہ سب باتیں مل کر اُس پر ایک نشہ سا طاری کر دیتیں، اور وہ سوچتی، کیا سوشیلا، اور کیا اُس کے ناخن، اونہہ! یہ اور بات تھی کہ سوشیلا اُس کی بہن تھی، بڑی بہن لیکن جب پرکاش چند نے معصوم سے لہجے میں نئے آویزوں کی تعریف کی، تو لیلا نے جواب دیا، میں کیا کرتی بھائی جان، میرے پاس کوئی اچھے آویزے ہی نہیں تھے۔ وہ پہلے تین جوڑے تو بالکل ہی بھدّے سے ہیں۔ کیا میں انہیں پہن کر پرکاش کے بیاہ پر جاؤں؟

اور سوشیلا نے ناخنوں پر پالش کرتے ہوئے نہایت بھولپن سے کہا بھائی جان آپ ہماری اُستانی مس سہگل کے ناخن دیکھیں تو بالکل حیران رہ جائیں، بالکل سپید، بے داغ، سچے موتیوں کی طرح، میرے ناخنوں پر تو ویسی چمک آتی ہی نہیں، اور بھاپا جی[1] پرکاش کے بیاہ میں ہم یہاں سے بس پر جائیں گے یا ریل پر؟ پرکاش وتی کے بیاہ سے دو دن پہلے، پرکاش چند، لیلا اور سوشیلا

---

[1] وسطی پنجاب میں بڑے بھائی کو 'بھاپا جی' کہتے ہیں۔ مقامی رنگ قائم رکھنے کے لئے اس لفظ کو جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔

لاہور سے روانہ ہوئے، پرکاش کی ماں نے اپنے بیٹے کو خرچ کے لئے پچیس روپے دیئے، پرکاش دتی کے لئے ایک پیلے رنگ کی جارجیٹ کی ساڑی اور دو روپے شگن کے، پھر بولی، دیکھو نا، جب پرکاش ڈولی میں سوار ہو، تو اُسے اپنے پاس سے دو روپے شگن کے اور دے دینا، اور ہاں دو روپے لڑکے کو بھی، دولھا کو، اور ـــــ بس کافی ہے،

جب پرکاش اور لیلا اور سوشیلا گھر سے تانگے پر سوار ہوئے، تو پرکاش کی ماں نے کہا، دیکھنا، بیٹا، ڈولی کے وقت، میرا خیال ہے، کہ بس دولھا، دولھن، دونوں کو ایک ایک روپیہ شگن دے دینا، آخر جب تمہارے بھائی کا بیاہ ہوا تھا، تو پرکاش وتی کی ماں نے کون سے خزانے لٹا دیئے تھے یہی ایک ایک روپیہ اُس نے دونوں کو دیا تھا، اور کہا، بس کافی ہے' اچھا بیٹا جاؤ، اب دیر نہ کرو،

لیکن جب تانگہ بالکل ہی چلنے لگا تو پرکاش کی ماں نے پھر اشارے سے اُسے ٹھہرا لیا، اور پرکاش کے قریب جا کر سرگوشیانہ انداز میں بولی سوشیلا اور لیلا کو ننگے سر نہ پھرنے دینا، سری پور پرانی وضع کا شہر ہے، کوئی لاہور نہیں اور یہ عادت تو مجھے بہت ہی بُری معلوم ہوتی ہے اور

اور پھر انہیں نینوں کے دوپٹے بھی نہ اوڑھنے دینا، اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے، کنواری لڑکیوں کو بہت ہنسنے بولنے بھی نہیں دینا چاہیئے۔ وہاں تو ہر وقت ڈھولک بجتی ہوگی، اسی لئے کہتی ہوں، بیٹا یہ دوآبے کے لوگ بڑے شکی مزاج ہوتے ہیں، ذرا کسی لڑکی کو ننگے سر دیکھ لیا اور وہیں انگلی اٹھادی، اور سر اُٹھا کر چلنا بھی شریف زادیوں کا دستور نہیں، کم از کم دوآبے کے لوگ اُسے پسند نہیں کرتے، نظر نیچی، شرم اپنی اور......

پرکاش نے گھبرا کر کہا، بہت اچھا ماں، بہت اچھا۔

ریل جاچکی تھی، اس لئے پرکاش، سوشیلا اور لیلا کو مجبوراً خضر بس کا آسرا لینا پڑا۔ دوپہر کے وقت خضر بس سروس کی لاری نے انہیں بٹالہ پہنچادیا، بٹالہ پہنچ کر انہوں نے سری پور کو جانے والی لاریوں کے اڈّے کی تلاش کی اور آخر انہوں نے اُسے رابرٹس پارک کے قریب پالیا، یہ ایک بالکل نئی دنیا تھی، پرکاش چند ایک خالص سو فیصدی شہری تھا، جس کی ساری زندگی لاہور کی گلیوں سڑکوں اور پارکوں میں چکر کاٹتے اور سیٹیاں بجاتے گذری تھی، یہاں پہنچکر اُس نے کچھ اور ہی نقشہ دیکھا، ایک بڑا سا پیپل کا درخت تھا اور اُس کے

نیچے تین بوسیدہ لاریاں، دائیں طرف رابرٹس پارک اور اسکے قریب ایک بڑا سا تالاب، تالاب میں پانی نام کو نہ تھا۔ رابرٹس پارک کے درختوں پہ پتوں کا نشان نہ تھا۔ سامنے ایک لق و دق چٹیل میدان تھا۔ کہیں کہیں خود جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں، اور آک پہ اُودے اُودے پھول آئے ہوئے تھے۔ ٹیالے رنگ کی کچی سڑک پر لاٹھی ٹیک کر چلتا ہوا ایک بوڑھا کسان نظر آ رہا تھا، اور کہیں کہیں کھیتوں میں ہل چلے ہوئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اپنے لب کھولے آسمان کی طرف تک رہے ہیں، کہ شاید کہیں سے پانی کی ایک بوند گر پڑے، واقعی ایک عجیب دنیا تھی۔ پرکاش نے اپنے ہیٹ کو دائیں طرف اور ترچھا کر لیا اور پھر ہمت سے کام لیکر اس نے ایک لاری میں لیٹے ہوئے ڈرائیور سے پوچھا "سری پور کو لاری یہاں سے جاتی ہے؟"

ڈرائیور ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا — "ہاں جناب، کیا کہا جناب آپ نے؟"

میں نے کہا "سری پور —"

ڈرائیور نے قطع کلام کرتے ہوئے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں جناب، یہیں سے"۔ فرنٹ سیٹ کو جھاڑتے ہوئے بولا "تشریف رکھیے ایک روپیہ کرایہ"

"کس وقت چلنا ہوگا"

"چار بجے، اب کیا وقت ہوگا جناب؟"

"اڑھائی!"

"بہت اچھا، بہت اچھا جناب؟ ابھی تو بہت وقت باقی ہے۔"

درمیانہ خانہ کھول کر پرکاش نے لیلا اور سوشیلا کو بٹھا دیا اور پھر ہیٹ اُتار کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دیہاتی ڈرائیور کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

"آپ ـــــ سری پور جا رہے ہیں؟"

"ہاں"

"کس کے ہاں؟"

"لالہ خودی رام کے ہاں"

"لالہ خودی رام؟ وہ جن کا بڑی ڈھاب کے پاس مکان ہے، ڈپٹی محمد حسین کے ساتھ، وہ جن کا لڑکا ابھی چند دن ہوئے چین سے واپس آیا ہے سُنا ہے وہاں روئی کے کسی کارخانے میں کام کرتا ہے۔ اس کی ہمشیرہ کی شادی آجکل ہونے والی ہے جو......"

"ہاں، ہاں، وہی۔"

"میرے خیال میں آپ پہلے تو کبھی سری پور نہیں گئے۔"

"نہیں"

"جی، ہاں، مجھے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے، میں نے آپ کو پہلے وہاں کبھی نہیں دیکھا
سری پور ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور ہم کس کو نہیں جانتے! لالہ کھودی رام سے تو میں
بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ بڑے نیک آدمی ہیں، ان کا گھر ڈپٹی محمد حسین کے
گھر کے ساتھ ہے۔ ڈپٹی صاحب بھی بڑے نیک آدمی ہیں۔ کیا بتاؤں جی ––
ڈپٹی صاحب کا بڑا لڑکا کیسا خوش شکل اور نیک طینت تھا، طبیعت میں کھوٹ
نام کو نہ تھا، پہلوان تھا جی پہلوان، ہمارے سری پور میں کشتی ہوئی، ڈپٹی کمشنر
صاحب بھی میلے پر آئے ہوئے تھے، وہاں اُس نے کشتی کی اور اللہ بخش کو
ہرا دیا۔ اللہ بخش بھی بڑا تگڑا پہلوان ہے مگر ہار گیا جی، کیا بتاؤں جی بڑا اچھا آدمی تھا
ضلعداری کا اُمیدوار تھا، لیکن دو ہفتے ہوئے بچارے کو کسی نے راتوں رات
قتل کر دیا۔ ہمارے ضلعے میں بہت قتل ہوتے ہیں۔ قتل اور چالان، ابھی پچھلے
مہینے میں میرا کوئی سات مرتبہ چالان ہو چکا ہے۔ کیا کریں، بابو جی، سڑکیں بالکل
کچی ہیں، گاڑیوں کا ستیا ناس ہو جاتا ہے۔ یہ لاری میں نے دو سال ہوئے نئی
لی تھی، آج آپ اس کی حالت دیکھیں۔ پائدان، پہیئے، بریکیں، مڈگارڈ سب
خراب ہو گئے ہیں۔ فضلے کی گاڑی اِس سے بھی بُری حالت میں ہے،" ––

او فضل، او فضل، اب حرامی، اُٹھ! دیکھتا کیا ہے، چل سٹیشن پر چلیں، سواریاں لے آئیں، دیر ہو رہی ہے۔ سورج چھپا چاہتا ہے۔ آج رات کو میری شاہ جی کے گھر دعوت ہے۔ سواری ملے نہ ملے، دعوت پر تو پہنچنا ہی ہے۔"
اتنا کہہ کر رجب علی ڈرائیور فضل دین ڈرائیور کو ساتھ لیکر ریلوے سٹیشن کی طرف سواریاں لینے چلا گیا، اور پرکاش چند کو چند لمحوں کے لئے بھونچکا سا چھوڑ گیا۔

ساڑھے چار بجے کے قریب جب لاری چلنے کو ہی تھی تو لالہ گھسیٹا رام سڑک پر ہانپتے ہوئے آتے دکھائی دیئے اور رجب علی کو انجن بند کرنا پڑا، پرکاش چند کی طرف دیکھ کر رجب علی نے معذرت کرتے ہوئے کہا: "لالہ جی سری پور کے بڑے ساہوکار ہیں، اور یوں بھی مجھ سے یہ تو نہیں ہو سکتا، کہ اپنے قصبے کے کسی آدمی کو یہاں رات بٹالے میں دھکے کھانے کے لئے چھوڑ جاؤں، مجبوری ہے، اگرچہ لاری تو اب بھر چکی ہے۔"
لاری واقعی بھر چکی تھی، درمیانے درجے میں جو عورتوں کے لئے تھا، سوشیلا اور لیلا کے علاوہ آٹھ دیہاتنیں بیٹھی ہوئی تھیں، اور سوشیلا اور لیلا کے خوبصورت

کپڑوں کی طرف دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھیں، یہ حیرانی دبی دبی سی تھی، اُن سے پرے تیسرے درجے میں اور لاری کی چھت کے اُوپر بھی جاٹ بیٹھے ہوئے تھے، چنانچہ جب لالہ گھسیٹا رام لاری کے قریب پہنچے تو رجب علی نے کہا، "آؤ شاہ جی"

"کہاں بیٹھوں ؟" لالہ گھسیٹا رام نے کہا۔

رجب علی نے ایک نظر پیچھے کی طرف دوڑائی، پھر آہستہ سے بولا" یہیں میرے پاس بیٹھ جائیے" لالہ گھسیٹا رام رجب علی کے قریب بیٹھ گئے، اُن کا چہرہ سُرخ تھا، اور چیچک کے داغ اس طرح دکھائی دے رہے تھے جیسے راستے کی مٹی پر بارش کے چند قطرے، دونوں ہاتھوں کی چھنگلیوں پر سونے کی انگوٹھیاں تھیں، اور گلے میں دانتوں کو صاف کرنے والا سونے کا خلال، کانوں میں سونے کی بڑی بڑی بالیاں تھیں۔

"بھائی رجبے!" لالہ گھسیٹا رام نے ایک لمبا آرام کا سانس لیکر کہا" میں تو کچہری سے بھاگتا ہوا آیا، اُمید نہ تھی کہ لاری مل جائے گی"

رجب علی نے پھر انجن کھولا۔ ایک پولیس کا سپاہی جس نے سری پور جانا تھا ڈرائیور کی کھڑکی کے قریب مڈگارڈ پر کھڑا ہو گیا۔ لاری آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

سوشیلا اور لیلا بولیں، "بھاپا جی!"

"کیوں؟" پرکاش نے پوچھا۔

"دم گھٹا جا رہا ہے۔"

رجب علی بولا "بی بی جی، ابھی لاری زور سے چلے گی، تو خوب ہوا آئیگی"

لالہ گھسیٹا رام نے ایک نظر پرکاش چند پر ڈالی اور ایک سوشیلا اور لیلا پر، پھر بولا، "آپ لالہ خودی رام کے ہاں جا رہے ہوں گے، پرکاش وتی کی شادی ہے نا!"

"جی" پرکاش بولا،

تیسرے درجے میں دو تین جاٹ زور زور سے باتیں کرنے لگے، ایک بولا "میں نے موتو جو سے کہا تھا کہ گواہی نہ دینا، وہ بنیا بڑا بدمعاش ہے"

دوسرا بولا، "موتو جو خود کہاں کا شریف ٹھہرا۔"

تیسرا کہنے لگا۔ "موتو جو پھر جاٹ بھائی ہے، لیکن وہ مہاجن ہے کھتری بھی نہیں"

لالہ گھسیٹا رام نے رجب علی سے کہا، زمانے کو تو جیسے آگ لگ گئی ہے بھائی بھائی کا دشمن، اب تو بنج بیوپار کا زمانہ نہیں رہا، ابھی میں راستے میں سیٹھ رنگ مل کے لڑکے کو سمجھا رہا تھا کہ جاٹوں کو روپیہ قرض نہ دو، سرکار سب

قرضے معاف کرنے پر تلی ہوئی ہے، اور اگر دوسرے بیوپاریوں کو اُدھار دو تو ساتھ ساتھ وصولی بھی کرتے رہو، ادھر اُدھار دیا، اُدھر وصولی کے لئے اپنا آدمی بھی دوڑا دیا۔ یہ آج کل کے بیوپار کا قاعدہ ہے۔"

رجب علی آہستہ سے بولا "کمبخت لسپٹن کام نہیں کرتا۔"

درمیانے درجے میں کالے رنگ کے لہنگے پہنے ہوئے ادھیڑ عمر کی دو لالائنیں باتیں کر رہی تھیں "اُس کی تو قسمت ہی پھوٹ گئی، تیرہ سال کی عمر میں ودھوا، ساری عمر مرنے والے کو روئے گی! اپنے چار ی کے بھاگ میں نے کریا پر دو ململ کے دوپٹے اور تین روپے نقد بھیج دیئے تھے۔ لیکن کرموں کی ماں تو بڑی کمینی اور بے مروّت نکلی....."

ایک جاٹ عورت جس کے کانوں میں چاندی کی بڑی بڑی بالیاں پڑی ہوئی تھیں، بار بار اپنے بچّے کو بہلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی، اُس کے ساتھ کی عورت تنگ آکر بولی، "بہن اسے چھاتی کیوں نہیں دیتیں۔"

"میں تو چھاتی دیتی ہوں، مگر یہ پیتا ہی نہیں، شاید اس کے پیٹ میں درد ہے، اُ رر ۔ آ ۔ آ ۔ اُس ۔ ای ۔ ای ۔ سو جا میرے لال ۔ سو جا —— ہائے مر جا تو، جان کھائے جاتا ہے۔"

رجب علی گھسیٹا مل کی طرف اُٹھ کر بولا" پسٹن کام نہیں کرتا شاید" لیکن گھسیٹا مل پرکاش چند کی سیٹ پر جھکا ہوا اُونگھ رہا تھا۔

پچھلے درجے میں ایک تحصیل کا چپڑاسی ایک جاٹ سے جھگڑ رہا تھا"تابیہ ۵ فی صدی کم ہو، آبیانہ ہٹا دیا جائے، چوکیدارہ بند ہو جائے تو سرکار کا کام کیسے چلے؟"

جاٹ بولا۔"پہلے کیسے چلتا تھا، جب حاکم کی تنخواہ پانچ روپے ہوتی تھی"۔

"تم سِکھا شاہی چاہتے ہو"

"نہیں جٹا شاہی" ایک اور جاٹ نے جواب دیا۔

ایک کسان عورت دوسری سے کہنے لگی"بچن کی ماں دلدار سنگھ کے ساتھ بھاگ گئی ہے، تم نے سُنا؟"

"اب بچن کا باپ ٹکوا لئے ان کی تلاش میں پھرتا ہے"۔

پرکاش چند کے ذہن میں چوتھی جماعت کی اُردو کی کتاب کا ایک سبق گھومنے لگا۔ دیہاتی اور شہری زندگی کا موازنہ، دیہات کی زندگی کتنی دلکش اور پُرلطف ہوتی ہے' سادہ اور معصوم پرکاش نے سوچا، کاش مجھے اُردو کی چوتھی کتاب کا مصنف کہیں مل جائے، تو ٹکوے سے اُس کا سر گردن سے الگ کر دوں۔

سوشیلا اور رلیلا نے پکارا "بھائی جان، پانی، دم گھٹا جاتا ہے"
رجب علی بولا "آگے نہر آئے گی، اُس کے قریب ہی ایک کنواں ہے، اس کا پانی بہت میٹھا اور ٹھنڈا ہے، کیوں لالہ جی؟"
گھسیٹا رام چونک پڑا "ہاں۔ جی، پکّی پینٹھی، کیا کہتے ہو، اوہ رجب میں کیا سو گیا تھا؟"

"ہم کہاں آپہنچے ہیں؟"
پرکاش نے چند سنگترے پھلوں کی ٹوکری سے نکال کر سوشیلا اور رلیلا کو دیئے۔
رجب علی بولا "نہر کے قریب، لالہ جی!"
گھسیٹا رام لبوں پر زبان پھیر کر بولا "اوہ، بہت پیاس لگی ہے کنوئیں پر پانی پئیں گے"
رجب علی کہنے لگا۔ میں بابو جی سے کہہ رہا تھا کہ نہر کے کنوئیں کا پانی بہت ہی میٹھا اور ٹھنڈا ہے"
پرکاش چند کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا، حدِ نظر تک خشک سے کھیت کہیں کہیں کیکر کے جھنڈ، لاری آہستہ آہستہ نیم ریتیلے میدان میں چل رہی تھی، کچی سڑک پر گرد کا طوفان اٹھ رہا تھا، دھوپ بے حد تیز تھی اور آگ کے شرارے

کی طرح زمین پر گرتی ہوئی معلوم دیتی تھی، آگ......کے پھول دھوپ میں بالکل مصنوعی معلوم ہوتے تھے۔ ایک بڑے پیپل کے درخت کے نیچے گائیں اور بھینسیں آرام کر رہی تھیں لیکن اُن کا رکھوالا وہاں نہ تھا..... یہ ایک گاؤں تھا سڑک کے اس طرف لاری ایک گندے جوہڑ کے قریب سے گذر رہی تھی، ایک بھینس پانی میں گھس رہی تھی، ایک عورت خاکی رنگ کی قمیص اور کالے رنگ کا لہنگا پہنے پانی بھر رہی تھی، ایک لڑکی سڈول اور سانولی باہوں والی نوجوان لڑکی، ڈنڈے سے چند بھیگے ہوئے کپڑے کوٹ رہی تھی، سڑک کی دوسری طرف ایک بڑا سا بڑ نظر آ رہا تھا، جس پر ڈاک کے لئے کا سُرخ ڈبہ لٹکا ہوا تھا، درخت کے نیچے ایک ٹوٹا ہوا چھکڑا پڑا تھا، اُس پر چار سکھ جاٹ ایک بے حد میلی تاش کھیل رہے تھے، پھر وہی میدان تھا، وہی ریتلی سڑک، وہی تیز دھوپ اور میلوں تک پھیلے ہوئے کھیت۔

پرکاش چند نے سوچا، زندگی نہ دیہاتی ہوتی ہے نہ شہری، بلکہ محض "زندگی" کوئی اس کا کوٹ پکڑ کر کھینچ رہا تھا، پرکاش چند نے مڑکر دیکھا: ایک چھوٹا سا خوبصورت بچہ! اپنی ماں کے کندھے سے لگا ہوا اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کا کوٹ پکڑ رہا تھا، اس کی ماں سیٹ سے سر لگائے سو گئی تھی، وہ اُس کا

ایک رُخ دیکھ سکتا تھا، ایک جوان جاٹ عورت، گندمی سا رنگ، کان میں سونے کی بالیاں، تیکھے نقش، لمبی لمبی سیاہ پلکوں نے رخساروں پر صف باندھ رکھی تھی

بچہ پرکاش چند کو اپنی طرف تڑتے ہوئے دیکھ کر ایک لمحہ کے لئے حیران ہو گیا۔ پھر خود بخود ہنس پڑا، اور اُس کا کوٹ کھینچتے ہوئے بولا "او تو ——— تو — لی۔"

پرکاش چند نے اُسے ایک سنگترہ دیا، اور بچے نے اس کا کوٹ چھوڑ دیا، اور گنگنایا "او تو —— لو — لی - او۔"

جاٹ عورت بیدار ہوگئی، اُس کی آنکھیں کھُلتے ہی پرکاش چند کو محسوس ہُوا۔ گویا کہیں آسمان پر یکایک دو ستارے روشن ہو گئے ہیں، جب ماں نے اپنے بچے کے ہاتھ میں سنگترہ دیکھا تو اُس کے خواب آلود چہرے پر اُس کے نیم متبسم لب پرکاش چند کو بہت دلفریب معلوم ہوئے، اُس کے شباب میں اُس نے ایک آسودگی اور دوشیزگی سی محسوس کی اور اُسے خیال آیا کہ دیہاتی زندگی شہری زندگی سے کہیں بہتر ہے۔

لاری چلتے چلتے تھم گئی، ایک بوڑھی عورت ایک چھوٹی سی لڑکی کو ساتھ لئے راستے کے بیچ میں کھڑی تھی۔ بولی "ہمیں سری پور جانا ہے۔"

رجب علی بولا "اماں، جگہ تو بالکل نہیں"
بوڑھی عورت بولی "بیٹیا، میں سہارا لیکر کہیں کھڑی ہو جاؤں گی، ہاں اگر تو اس میری لڑکی کو کسی کونے میں بٹھا دے"۔ رجب علی نے ایک کسان سے کہا کہ وہ لاری کی چھت پر چلا جائے، اور بوڑھی عورت کے لئے جگہ خالی کر دے۔ کسان لاری کی چھت پر چلا گیا۔ جہاں پہلے بھی چار پانچ دیہاتی بیٹھے ہوئے تھے اور جب لاری چلی تو انہوں نے گانا شروع کیا۔

او بنتو! ——
بنتو دا سر بن ورگا
بنتو دا منہ چن ورگا
بنتو دا لک چیترا
او بنتو ——

پرکاش نے دل ہی دل میں جاٹ کی شاعری کی تعریف کی، بنتو ایک جاٹ کی محبوبہ ہے لیکن اسکے سر کے بال ایسے ہیں جیسے ایک وسیع جنگل، اُس کا چہرہ چاند اور اس کی کمر چیتے کی سی، جاٹ کی شاعری میں اس کے دیہات کے کھُلے کھیتوں کی سی وسعت اور سادگی پائی جاتی ہے، پرکاش نے چونکا ہو ل

سے پھر نوجوان عورت کی طرف دیکھا، بچے نے اُس کا کوٹ پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے، اور نوجوان عورت کی نگاہیں پرکاش کی نگاہوں سے مل گئیں۔

لاری نہر کے پُل پر سے گزر گئی، آگے جاکر ایک کنواں آیا، وہاں لاری ٹھہر گئی، اور مسافر پانی پینے لگے، پرکاش نے چاندی کا سفری گلاس نکالا اور سوشیلا اور لیلا کو پانی پلانے لگا، جب وہ پانی پی چکیں تو نوجوان عورت نے بھی آہستہ سے پانی پینے کی خواہش ظاہر کی، پانی واقعی ٹھنڈا اور میٹھا تھا، پرکاش نے دیہاتی عورت کو پانی پلاتے ہوئے محسوس کیا کہ ان میں ایک فطری شائستگی ہوتی ہے، دیہاتی عورتوں میں، لیکن بچہ بڑا شریر تھا، اُس نے پانی پیتے ہوئے گلاس کے پانی میں اپنے سانس سے بُلبلے پیدا کرنے شروع کر دیئے اور اُس کی ماں نے آہستہ سے گلاس اس کے ہاتھ سے چھین کر پانی نیچے گرا دیا، اور پھر محجوب نگاہوں سے پرکاش کی طرف دیکھ کہ گلاس اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

چند میل آگے جاکر نوجوان عورت لاری سے اُتر گئی، اُسے سامنے بسے ہوئے گاؤں میں جانا تھا۔ لاری سے اُترتے ہی اُس نے سرسوں کے ساگ کی سبز سبز کونپلوں کا گٹھا اپنے سر پر رکھ لیا، اور بچے کو کمر کے خم میں، اُس نے ایک نگاہ پرکاش پر ڈالی، گویا کہہ رہی تھی، مجھے اچھی طرح دیکھ لو، ہم تم پھر

کبھی نہیں ملیں گے، میں اب اپنے گھر جا رہی ہوں۔ جہاں میرا خاوند اپنی بنتو کا انتظار کر رہا ہے، میں کماد کی فصل کاٹوں گی، گیہوں کی بالیاں الگ کروں گی اور باجرے کی روٹیاں اور چھاچھ کی مٹکیا لیکر اپنے گھر والے کے پاس کھیتوں میں جاؤں گی، یہی وہ پگ ڈنڈی ہے۔ جہاں سے میرا اور تمہارا راستہ ہمیشہ کے لئے الگ ہوتا ہے۔

اور پرکاش جو باغیانہ خیالات رکھتا تھا۔ اپنے دل میں کہنے لگا، ٹھیک ہے بنتو، اس میں میرا یا تمہارا کوئی قصور نہیں، یہ سماج کا قصور ہے۔ اس زندگی میں اب کوئی خالص مرد یا عورت نہیں، بھائی، بہن، خاوند، بیوی، بھانجا، بھتیجی، ماموں، پھوپھی اور خالہ ہیں، لیکن ایسا کوئی نہیں جو اپنے آپ کو مرد یا عورت کہے۔ کیسی عجیب بات ہے۔

نوجوان عورت آہستہ سے پگڈنڈی پر مڑ گئی، اُس کی ہلکے سبز رنگ کی قمیص پر روپہلی کناری دھوپ میں چمک رہی تھی۔

پرکاش نے دل میں کہا، خدا حافظ، خدا حافظ اس لئے کہ ہم انسان ہیں لیکن اگر ہم انسان نہ ہوتے بلکہ کبوتر یا چڑیا...... تو...... اور پرکاش کے شاعرانہ تخیل نے دیکھا، کہ وہ دونوں کبوتر بن گئے، اور اپنے سفید پر پھیلائے ہوئے اُڑے

جا رہے ہیں۔ نڈر، بے باک، خوش، نہیں وہ چڑیوں کا ایک جوڑا تھے، اور ایک دوسرے سے بھاگتے ہوئے، ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوتے، ایک دوسرے پر جھپٹتے ہوئے اُڑے جا رہے تھے، سُورج مغرب میں غروب ہو رہا تھا اور کیکروں پر پیلے پیلے پھُول کھلے ہوئے تھے۔ مغربی آسمان پر شفق کی سُرخی تھی اور سطحِ زمین پر ایک سنہری دھند، کیکر کی پتلی، گھنی اور کانٹے دار ٹہنیوں کے بیچ میں سورج کی کرنوں نے ایک زرّیں گھونسلا بُن دیا تھا،

بلنتو اُڑ کر گھونسلے میں جا بیٹھی، پر پھیلائے ہوئے پرکاش کی طرف دیکھنے لگی اور چہکنے لگی "چ - چ - چوں چوں"۔ پرکاش نے اپنی چونچ اُس کی چونچ سے ملا دی، اور کیکر کے بہت سے پیلے پیلے پھُول اُن کے پروں پر گر پڑے۔ یکایک رجب علی بولا۔ یہ پسٹن کام نہیں کرتا۔

محوُر

سری پور کا قصبہ دریائے بیاس کے کنارے واقع ہے، یہ قصبہ کسی زمانے میں ایک اچھا خاصا شہر تھا۔ اسے سِکھوں کے ایک مقدس گورو نے چند اُونچے ٹیلوں پر بسایا تھا۔ لیکن اُن اُونچے ٹیلوں پر آہستہ آہستہ دریا کی لہریں چھا گئیں۔ پھر گیہوں کی

درآمد کم ہو گئی اور اُونچی اُونچی حویلیاں کھنڈر بن کر رہ گئیں، وقت، مذہب کا بھی پاس نہیں کرتا۔ چنانچہ سری پور کا مقدس شہر امتدادِ زمانہ سے ایک معمولی سا قصبہ بن کر رہ گیا۔ ایک چھوٹا سا بازار تھا۔ جہاں اکثر دکانوں پر حقّہ گڑگڑایا جا رہا تھا۔ یا تاش کھیلی جا رہی تھی۔ نحیف اور ادھ موئے سے کُتّے بازار کی نالیوں میں لیٹے ہوئے تھے، اور دو تین آوارہ گدھے اپنے لمبے لمبے کان ہلاتے، بازار کی رونق دیکھتے ہوئے جا رہے تھے۔ کیونکہ آج بازار میں دور دیہ رنگ برنگ کی جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں یہ جھنڈیاں بازار کے پہلے دروازے سے شروع ہو کر جہاں لاری کا اڈہ تھا، لالہ خودی رام کے گھر تک لگی ہوئی تھیں۔ جو ایک چھوٹی سی جھیل کے قریب واقع تھا، یہ جھیل اُسی زمانے میں ایک اُونچا ٹیلہ تھی۔ اب دریائے بیاس کے پانی سے ہی... بھری ہوئی تھی۔ پر کاش چند نے سوچا، اس قصبے میں کتنا امن ہے۔ اچھا تو یہ دیہات ہے۔ یہاں تو لوگوں کو کوئی کام نہیں۔ زندگی کی رفتار کتنی مدھم اور سکون آمیز ہے۔ دریائے بیاس کے پانی کی طرح، یہاں آدمی چاہے دن بھر تاش کھیلے۔ چاہے چرخہ چلائے، بہر صورت چرخہ تاش سے بہتر ہے۔ اُس نے دل ہی دل میں گاندھی جی کی فراستِ طبع کی داد دی۔ چند ایک لوگوں نے اُسے گھور کر دیکھا، سوشیلا اور لیلا اُس کے ساتھ ساتھ لگی چلی آ رہی تھیں۔ ان کے بھڑکیلے

لباس جو بازار میں لگی ہوئی جھنڈیوں کی طرح رنگین اور جاذبِ نظر تھے کتنوں ہی کی نظروں کو خیرہ کرتے۔ ایک دکان پر ایک گاڑی بان چھکڑے پر سے بنولے کی بوریاں اُتار کر رکھ رہا تھا، وہ انہیں دیکھ کر بنولے کی بوریاں اُتارنا بھول گیا، پھر اُس کے لبوں پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی، اُسے جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی، اور اس کا چہرہ جیسے کسی اُلجھن سے فوراً صاف ہو گیا جب سوشیلا لیلا اور پرکاش چند اُس کے قریب سے گزرے سے تو گاڑی بان بڑے مزے سے گنگنایا۔

اِک بنگلہ بنے نیارا......

اور پھر بنولے کی بوریاں دکان پر پھینکنے لگا، سوشیلا اور لیلا کے چہرے شرم سے گلابی ہو گئے، اور پرکاش چند نے سوچا کہ ہندوستانی غریب طبقوں میں بھی شخصی جائداد کی حس کتنی تیز اور شدید ہے۔ اس بنگلے کی ہوس نے ہمیں بزدل، غلام اور خوشامدی بنا دیا ہے۔ ایک ہندوستانی کی جنت تین چیزوں پر مشتمل ہے۔ بیوی، بچہ اور بنگلہ، لالہ خودی رام کے مکان کے دروازے پر بینڈ بج رہا تھا۔ پرکاش چند نے لالہ خودی رام کے پاؤں چھوئے اور سوشیلا اور لیلا نے ایک کونے میں سمٹ کر ہاتھ جوڑے۔ لالہ خودی رام کا لڑکا بیر بھاگتا اندر سے آیا اور پرکاش چند کے گلے سے لگ گیا۔ وہ دونوں چار سال کے بعد ایک دوسرے

سے ملے تھے۔ بیرا اب پہلے سے لمبا، مضبوط اور جوان ہو گیا تھا، چین کے دور دراز
ملک میں رہ کر اس نے دنیا کے بہت سے نشیب و فراز دیکھ لئے تھے، اس کے
لہجے میں خودداری تھی اور بلند حوصلگی، اور خود اعتمادی، جب وہ سری پور سے گیا تھا،
تو بالکل ایک لڑکا سا تھا، چہرے پر خط بھی نہ آیا تھا اور بالکل کالج کے لڑکوں کی طرح
باتیں کیا کرتا تھا۔ اور اب...... اب پرکاش چند کو افسوس ہوا کہ وہ خود کیوں
اتنے عرصے تک لاہور کے کنوئیں کا مینڈک بنا رہا، ماحول کا اثر، تن آسانی یا ایک
جبلی کمزوری، لالہ خودی رام کے گھر کے اندر پرکاش چند کی خالاؤں، پھوپھیوں،
بھانجیوں، بھتیجیوں اور رشتے کی بہنوں کا کوئی شمار نہ تھا، انہوں نے سوشیلا اور
لیلا کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور پانچ منٹ میں ان کے پاؤں سے سٹریم لائن۔
STREAM LINE سینڈلوں سے لیکر کان کے آویزوں تک کو پرکھ کر رکھ
دیا، باتفاق رائے پاس ہوا کہ سوشیلا اور لیلا دونوں لاہور کی میمیں ہیں۔ سوشیلا
کے لمبے لمبے ناخن دیکھ کر کئی لڑکیوں کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ناخنوں پر سرخ
رنگ کا پالش کیا گیا تھا، جس کی مافوق چمک کے آگے حنائی رنگت ماند ہو گئی تھی
اری...... بہن یہ کیا چیز ہے؟ کہاں سے آتی ہے؟ پتہ، پتہ، پتہ، لکھ دو پتہ،
لیلا کا چہرہ غصے سے بیر بہوٹی ہوا جا رہا تھا۔ اس کے طلائی آویزوں کی طرف

اب کسی کی توجہ نہیں رہی تھی۔ یہ چڑیلیں چلا چلا کر سوشیلا کے ناخنوں کو سراہ رہی تھیں۔ لیلا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مُردار تلیاں کہیں کی۔ اگر مجھے پتہ ہوتا....
آنگن میں چارپائی پہ پرکاش اور بیر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ بیر کی ماں مسکراتی ہوئی اُن کی طرف بڑھی، اُس نے ریشمیں اور پھُولدار شلوار پہن رکھی تھی زعفرانی قمیص اور سر پہ سنہری کنارے والا سُرخ دوپٹہ تھا۔ دونوں ہاتھوں میں دو انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں۔ بیر کی ماں نے مسکراتے ہوئے پرکاش کی ماں کا پرکاش وتی کی شادی پر نہ آنے کا شکوہ کیا۔ بیر نے بھی جھوٹ موٹ غصے کا اظہار کیا اور پرکاش نے بھی کچھ اس طرح سر جھکا کر شرمساری اور ندامت دکھائی کہ ہر ایک کی عزت رہ گئی۔ اور کسی کی بات بگڑنے نہ پائی۔ کیونکہ اس بات کا تو ہر ایک کو پتہ تھا کہ اگر شادی پر خاندان کے تمام قرابت دار اپنے گھر کے تمام لوگوں کو لیکے چلے آئیں تو جہاں جنگل میں منگل ہوسکتا ہے، وہاں منگل ہونے والے جنگل میں بھی آگ لگ سکتی ہے یعنی ایک پوری بارات گھر کے دروازے کے اندر ہو گی اور ایک باہر۔ اور اگرچہ بعض پُرانے خیالات کے لوگوں کے نزدیک لطف کی بات بھی یہی ہے۔ کہ دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی، لیکن بیر کی ماں اُن لوگوں میں سے نہیں تھی، اس لئے جب پرکاش نے معذرت پیش کی کہ آخر پیچھے گھر میں کسی کا رہنا ضروری تھا

تو وہ مسکرا دی اور اسکے سر کی بلائیں لیکر وہاں سے چلی گئی۔ پرکاش نے بیر سے پوچھا کہ چین کیسا ملک ہے اور بیر جواب دینے ہی کو تھا کہ رُک گیا، کیونکہ ایک حسین، شرمیلی لڑکی جس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں کنوار پنے کی نازک پاکیزگی کانپ رہی تھی۔ ان کی طرف جھجکتے ہوئے مدتوں سے بڑھی چلی آرہی تھی اور جب وہ بالکل ہی قریب آگئی تو بیر کے لب کانپنے لگے اور لڑکی کے رخسار گلاب کے پھول بن گئے۔ اس نے اپنی آنکھوں کو پلکوں کے پردوں میں چھپا لیا اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں لسی کے دو گلاس تھام رکھے تھے وہ ان کے قریب آکر کھڑی ہو گئی اور منہ سے کچھ نہ بولی۔ بیر نے آہستہ سے جیسے وہ گلاب کی کسی پتی کو چھو رہا ہو۔ اس کے ہاتھوں سے گلاس لے لئے۔ اور ایک گلاس پرکاش کے ہاتھ میں دیکر دوسرا اپنے منہ تک لے گیا۔ لڑکی اب بھی خاموش تھی۔ لیکن پرکاش نے ایک لمحے کے لئے اس کی پلکیں اُٹھتی ہوئی دیکھیں۔ ایک لمحے کے لئے اُس نے اس لڑکی کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور پرکاش کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ آہ، یہ دل کی دھڑکن۔ اُس نے سوچا "کبھی کبھی کسی خوبصورت چیز کو دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ رُکے ہوئے خون میں طوفانی ریلے آ جاتے ہیں۔ شاید ابھی حسن کا احساس پوری طرح مرا نہیں" دفتر کی میز نے ابھی

اُس کی روح کو کچل نہیں دیا تھا۔

کچھ دیر کے بعد پرکاش نے پوچھا "یہ کون تھی؟"

بیر نے کہا "چین بہت اچھا ملک ہے۔"

پرکاش نے کہا "میرا اشارہ اُس لڑکی کی طرف تھا۔ جو لسی کے دو گلاس ہمارے لئے لائی تھی۔"

بیر نے کہا "چین کے لوگ افیم کھانے اور چینی کے برتن بنانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اُن کی زندگی.....

پرکاش چارپائی سے اُٹھ بیٹھا، کہنے لگا۔ بھاڑ میں جائے اُن کی زندگی۔ ہماری زندگی کب اُن سے بہتر ہے اور تم یہاں چینیوں کے داؤں ہم پر آزمانا چاہتے ہو۔ ذرا سنبھل کر چلنا۔ یہ شنگھائی نہیں۔ سری پور ہے۔ چینیوں کا خدا ہمارا خدا نہیں۔ ہماری زندگیاں چینی کے برتنوں کی طرح خوبصورت نہیں۔ بلکہ مٹی کے برتنوں کی طرح میلی اور ناصاف ہیں لیکن میں کس گدھے سے بات کر رہا ہوں۔ اچھا میں کوٹھے پر چلتا ہوں۔ ذرا پرکاش وتی سے دو میٹھی میٹھی گالیاں سن آؤں۔

بیر نے کہا۔ پرکاش وتی سے مل کر باہر بیٹھک میں آجانا۔ تمہیں اپنے چند نئے دوستوں سے ملاؤں گا۔

پرکاش وتی دوسری منزل میں ایک کمرے کے کونے میں دیوار سے ٹیک

لگائے بیٹھی تھی۔ پرکاش کا خیال تھا کہ وہ بہت سی لڑکیوں میں گھری ہوگی اور اسے دو چار میٹھی میٹھی گالیاں سننے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ لیکن حسنِ اتفاق سے وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ پرکاش بہت خوش ہوا، اس نے پرکاش وتی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسکی حنائی انگلیوں کو زور زور سے مسلنے لگا۔ لیکن پرکاش وتی بولی نہیں۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ سے پرکاش وتی کی ٹھوڑی کو اُونچا کیا اور کہنے لگا۔ سنتی ہو بہن ! تمہارا بھائی تمہیں بدھائی دینے آیا ہے اور تم ہو کہ اپنی آنکھوں میں آنسو روکے بیٹھی ہو، اور پرکاش وتی سچ مچ اپنی آنکھوں میں آنسو روکے بیٹھی تھی۔ یہ بات سنتے ہی وہ ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ پرکاش بولا۔ تو تو کہتی تھی کہ میں بی۔ اے پاس کر کے نوکری کروں گی۔ یا کہانیاں لکھوں گی اور شاعری کروں گی۔ اب بتا، یہاں تو تجھے کسی نے گیارھویں جماعت سے آگے نہیں پڑھایا۔ اور تُو تو شاید فلم ایکٹرس بننا چاہتی تھی۔ اب وہ اداکاری کے ولولے کہاں گئے؟ تیرے وہ سونے کے تمغے جو تُو نے مہا ودیالیہ میں ناچ ناچ کر حاصل کئے تھے اب کہاں ہیں؟

پرکاش وتی نے رو کر کہا۔ اسی لئے تم مجھے جلانے آئے ہو۔ کیا میں اب تم سے بھی ہمدردی کی اُمید نہ رکھوں؟

پرکاش چپ رہا اور چند لمحوں تک آنسوؤں کی اُن دو ندیوں کی طرف تکتا

رہا۔ جو اپنی روانی میں زندگی کے پورے نہ ہونے والے سپنوں کو بہائے لئے جا رہی تھیں۔ اُسے پرکاش وتی سے بہت محبت تھی۔ پرکاش وتی اُسے بہنوں کی طرح عزیز تھی۔ شاید بہنوں سے بھی زیادہ۔ کیونکہ سارے خاندان میں وہی ایک لڑکی تھی جو اس کی طرح ادبی مذاق رکھتی تھی۔ اُسے پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ بہت اچھا گاتی تھی اور ایک تیتری کی طرح ناچ سکتی تھی۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ پرکاش وتی کی شادی کسی اچھے آدمی سے ہو۔ اُس کی مراد ایسے آدمی سے تھی۔ جسے عام لوگ بُرا کہتے ہیں، مثلاً ایک خوبصورت طرحدار نوجوان جسے اچھے لباس کا شوق ہو، جو گانے اور ناچنے کا شوقین ہو، جو حُسن کی قدر کر سکے۔ پڑھا لکھا ہو اور کبھی کبھی کوئی شعر گنگنا سکے۔ غرض کہ ایک ایسا آدمی جو ہندوؤں کے متوسط طبقے کی مستورات میں بہ نظرِ حقارت دیکھا جاتا ہو۔ اور اُسے یہ بھی پتہ تھا کہ پرکاش وتی کی بھی یہی مرضی تھی۔ لیکن نہ تو پرکاش وتی میں اپنی مرضی برتنے کی ہمت تھی اور نہ اُس کے ماں باپ کا تخیل اس قدر بلند تھا۔ وہ "بے حیا" نہ تھے۔ انہوں نے کبھی سینما تک نہیں دیکھا تھا۔ اور زندگی بھر اپنے بالوں میں آملے کا تیل درجۂ اول نہیں لگایا تھا، نہ کبھی ٹیڑھی مانگ نکالی تھی۔ ان کے وقت میں سکولوں میں ناچ اور گانے نہیں سکھائے جاتے تھے۔ بلکہ لوگ ہاشمشٹ اور اُستتی باچن پڑھائے

جساتے تھے۔ پھر بھی انہوں نے اپنی لڑکی کو گیارھویں تک پڑھایا تھا۔ اُسے سری پور کے گاؤں سے دور ایک دوسرے شہر کے مہاودیالیہ میں داخل کرایا تھا۔ لیکن شادی کے معاملے میں وہ بے حیائی نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے سوچ بچار کر اور اچھی طرح دیکھ بھال کر ایک امیر گھرانے کا لڑکا پسند کیا تھا۔ لڑکے کے ماں باپ امرت سر کے مشہور ساہوکار تھے اور تھوک ہلدی بیچتے تھے۔ ہلدی بیچ بیچ کر انہوں نے امرت سر میں لاکھوں کی جائداد بنالی تھی۔ انہوں نے لڑکی کے لئے نہایت اچھا بر ڈھونڈا تھا۔ کیونکہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ ازدواجی زندگی کی اصلی مسرت چند شعروں پر نہیں بلکہ ہلدی کی بے شمار گانٹھوں پر قائم ہے۔ عورتوں کا کام پڑھنا لکھنا اور ناچنا نہیں، بچے جننا اور برتن مانجھنا ہے۔ زندگی کا اصلی لطف برتن صاف کرنے میں ہے شعر کہنے میں نہیں۔ خیالی دنیا عملی دنیا سے بہت الگ ہے۔

بے وقوف پرکاش وتی کے آنسوؤں کو دیکھ کر پرکاش کو بہت غصہ آیا۔ کہنے لگا۔ "لاکھوں کی جائداد کی مالک بن رہی ہو۔ اور اب یوں ٹسوے بہا رہی ہو۔ شرم نہیں آتی تمہیں؟"

پرکاش وتی روتے روتے ہنس پڑی؟ کہنے لگی۔ مجھے اس طرح تنگ کرنے میں تمہیں کیا فائدہ ہے؟ جاؤ ہٹو۔"

پرکاش نے کہا "ہم نہیں ہٹیں گے، کوئی بات ہے بھلا یہ بھی؟ یوں آنسو بہا کر ہم پر رعب جمایا جا رہا ہے۔ اے جلدی بیچنے والے کی ہونے والی بیوی، ہم تم سے ایک بات پوچھنا چاہتے ہیں۔ جواب دو گی؟"

پرکاش وتی نے کہا۔ "تم لاکھ بار پوچھو۔ ہم تب بھی نہیں بتائیں گے۔"

پرکاش نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "دیکھو جب تک تم خود نہ اڑو۔ اپنے پر نہ پھڑپھڑاؤ۔ یہ زمین تمہیں اڑنے نہ دے گی۔"

پرکاش وتی نے کہا۔ "کوئی پر پھڑپھڑائے بھی تو اڑ کر کہاں جائے؟ یہ بھی تم نے کبھی سوچا ہے!"

اس کی آواز پھر بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔

اور پرکاش چپ ہو گیا۔ لاجواب ہو گیا۔ ہنسی ہنسی میں اس نے پرکاش وتی کے دل کے درد کو پا لیا تھا۔ اسے ہمدردی بھی تھی۔ لیکن یہ بھی خیال تھا کہ اگر پرکاش وتی چاہتی تو اپنی مرضی کا بر ڈھونڈھ سکتی تھی، یا اپنے ماں باپ کو مجبور کر سکتی تھی۔ لیکن پرکاش وتی کے دو بے ساختہ فقروں نے اسے احساس کرا دیا کہ یہ خیال کتنا غلط تھا اور عملی طور پر کس قدر ناممکن اندھی سماج کے قفس میں پر پھڑپھڑانا بے سود ہے۔ اس سے یہی بہتر ہے کہ مرد ہلدی بیچے اور عورت ہلدی بیچنے والے کی وفادار

بیوی بن کر برتن صاف کرے۔ اُس نے پرکاش وتی کے آنسو پونچھ ڈالے، اور پرکاش وتی نے اُس سے کہا کہ اگر تم شادی میں نہ آتے۔ تو شاید میں مر ہی جاتی۔ مجھ میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ اس خوفناک شادی کے تمام مراحل سے ایک انجان اور شرمیلی دلہن کی طرح گزر جاؤں۔ اب تمہارے ہونے سے میری ہمت بندھ جائے گی۔

پرکاش نے کہا "تم تو جھوٹ بھی اس طرح بولتی ہو کہ بالکل سچ معلوم ہوتا ہے" پھر ہنس کر کہنے لگا "آخر ایک دکاندار کی بیوی ہونا!"

پرکاش وتی نے بھویں اُوپر چڑھائیں اور کچھ کہنے ہی کو تھی کہ ایک دُبلا پتلا سا لڑکا اندر کمرے میں داخل ہوا، کہنے لگا "پرکاش جی کو سائیں جی کے پتا جی بلاتے ہیں"

پرکاش نے پوچھا۔ سائیں جی کون ہیں؟"

پرکاش وتی بولی۔ یہ لڑکا اپنے آپ کو سائیں جی کہتا ہے۔ پاگل ہے، اس کا باپ پٹواری ہے۔

پرکاش نے پوچھا۔ سائیں جی کے پتا جی کہاں ہیں؟

لڑکے نے کہا۔ باہر بیٹھک میں تیر کے پاس بیٹھے ہیں۔

پرکاش نے کہا۔ اچھا تو میں چلتا ہوں۔ اب تم بھی سہیلیوں میں بیٹھو، ہنسو کھیلو، آخر یہ شادی ہے تمہاری۔

پرکاش وتی پاؤں کے انگوٹھے سے مٹی کریدنے لگی۔

باہر بیٹھک میں بہت سے آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ اور بیر نے پرکاش کا تعارف سب سے کرایا۔ چونی لال، قصبے بھر میں ہاکی کا زبردست کھلاڑی اور بیر کا چھٹپن کا دوست، لالہ سیتا رام پٹواری لمبا، دبلا، پتلا، ناک پر عینک، اور عینک کے پیچھے دو اُداس سی آنکھیں ایسی آنکھیں جو اکثر پٹواریوں کے پاس نہیں ہوتیں" خوش رو متین برجیندر، بیر کا بھنوئی جو ڈاک خانے میں ایک ممتاز عہدے پر ملازم تھا، ہر وقت ہنسنے والا بوٹا سنگھ قصبے کے سیٹھ کا لڑکا، دھن تیال جس کا باپ بمبئی کے ایک زبردست تاجر کا منیم تھا۔ اور رام لال، منگت رائے، پھیرو، رامو، ڈھیرو اور گاؤں کے وہ تمام معزز آدمی جن کے بغیر کوئی شادی کامیاب نہیں ہو سکتی، جن کی صورتیں منحوس ہوتی ہیں، کپڑے غلیظ اور داڑھیاں الجھی ہوئی لیکن جن کا دل سونے کا ہوتا ہے اور ہاتھ لوہے کی طرح مضبوط، یہ وہ نیک دل فرشتے ہوتے ہیں جو تین چار سو آدمیوں کی بارات کو چٹکیوں میں بھگتا دیتے ہیں۔

اور جب گھی میں کچوریاں تلنے بیٹھتے ہیں تو گھنٹوں بغیر حقّے کی مدد کے، تلتے ہی رہتے ہیں اور جب کڑاہیاں مانجھنے پر آ جائیں تو بڑے بڑے جمعادری جھیوروں کو مات کر دیتے ہیں، یہ آدمی غریب ہوتے ہیں۔ لیکن شادی کے دنوں میں ان کی سماجی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے ان دنوں وہ چاچا، ماموں، تایا کے معززانہ القاب سے بلائے جاتے ہیں۔ شادی کے رسم و رواج سے یہ لوگ بہت واقف ہوتے ہیں اور جب عورتیں گھنٹوں جھگڑنے کے بعد بھی یہ فیصلہ نہ کر سکیں کہ جب دولہا آئے تو دروازے کی چوکھٹ پر سرسوں کا تیل ڈالنا چاہیئے یا زعفرانی گھی تو چاچا پھیرو ایک دم پانی کے گلاس میں چند چاول اور زعفران کے تنکے ڈال کر اُسے لنڈھا دیں گے۔ یہ لو۔ نہ تیل کا نقصان ہوا اور نہ گھی خراب ہوا، اور رسم بھی پوری ہو گئی۔ انہی باتوں سے تو یہ لوگ شادی بیاہ کے دنوں میں پُوجے جاتے ہیں۔

ہرچندر نے، جس سے ہیر کی بڑی بہن بیاہی ہوئی تھی، پرکاش سے پوچھا۔

آپ بھاپا جی، لاہور میں کیا کرتے ہیں؟

بھاپا جی؟ پرکاش نے سوچا۔ یہ صاحب مجھ سے کئی سال بڑے ہوں گے لیکن پھر بھی مجھے بڑا بھائی کہہ کر پکارنے پر مُصر ہیں۔ اور ایک انہی پر ہی کیا

موقوف ہے...... اور پھر یہ کاش کو وہ تمام واقعات اور وہ تمام شادیاں اور دیگر تقاریب یاد آئیں۔ جہاں بہت سے نئے ملنے والوں نے اُسے جھٹ بڑا بھائی بنا لیا تھا۔ شاید یہ اُس کی گنجی چندیا کا اثر تھا یا اُس کے چہرے کی کیفیت کا کہ جس سے ادھیڑ پن ٹپکتا تھا۔ لیکن اُس میں اس کا کیا قصور تھا۔ پرانے واقعات کی یاد بہت تلخ تھی۔ جس نے اُسے قبل از وقت معمّر کر دیا تھا۔ لیکن موجودہ زندگی بھی چنداں خوشگوار نہ تھی، کنبے کا پیٹ بھرنے اور روزی کمانے کے بکھیڑوں نے اُس کی روح کو کچل دیا تھا۔ اور اُس کے ضمیر اور اُس کے اخلاق کو نیم مردہ کر دیا تھا۔ ہاں کبھی کبھی وہ سوئی ہوئی خلش بیدار ہو جاتی تھی اور پھر اُس کی ٹیس سے متاثر ہو کر اُس کا جی چاہتا کہ وہ کپڑے پھاڑ کر نکل جائے اور چیخ چیخ کر قدرت اور سماج کے وحشیانہ مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے لیکن یہ طوفان ہمیشہ دل کی چار دیواری تک ہی محدود رہتا۔ اس کا اثر صرف اس کی اپنی ذات ہی پر تھا اور جس طرح طوفان ساحل کی دیوار کو توڑ پھوڑ ڈالتا ہے۔ اسی طرح اُس کی اندرونی زندگی بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی، اس کی جوانی راکھ کا ایک ڈھیر اور روح ایک لتھڑی ہوئی لاش، اس لئے اب جب کوئی اُسے بھاپا جی کہہ دیتا تو اُسے چنداں حیرت نہ ہوتی۔ اور وہ اپنے دل کی اُداسی کو اپنے لبوں کی مسکراہٹ میں چھپا

یقیناً اور اپنے مخاطب کی شوخ کلامی
کہہ کر اپنے آپ کو جوان بنا لیا تھا۔

پرکاش نے کہا: "میں کواپریٹیو بنک میں

"کیا تنخواہ ملتی ہے؟"

"پچھتر روپے۔"

"پچھتر روپے؟" پٹواری نے کہا۔ "تب تو مزے میں ہیں آپ بھائی صاحب!"

"جی۔ آپ کی عنایت ہے۔"

بوٹا سنگھ ہنسنے لگا۔ گاؤں کے سیٹھ کا لڑکا ہر وقت ہنستا رہتا تھا۔ پرکاش کو اُس کا ہنسنا بہت بُرا لگا۔ لیکن اس ہنسنے میں کوئی بُرائی نہ تھی۔ یہ زندگی اور بےفکری کا ایک مسلسل قہقہہ تھا جس میں پرکاش کی پریشانی نگاہوں کو طنز کے تیر و نشتر چھپے ہوئے نظر آئے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بوٹا سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا: "پٹواری جی کوئی گیت سنائیے۔"

پرکاش نے پٹواری کی اُداس آنکھوں سے پوچھا: "کیا تمہیں گیت بھی یاد ہیں؟"

پٹواری نے بوٹا سنگھ سے کہا۔ "بھئی، اس وقت جی نہیں چاہتا۔"

پرکاش نے پٹواری کی اُداس آنکھوں کی اُداسی کو دیکھ کر کہا۔ "بے شک تمہیں

...کی گیت یاد ہوں گے۔ کئی گیت، جو تمہاری اُداسی نے خود بنائے، جو تمہارے دل کے تاروں سے نکلے اور جو کئی جنموں تک تمہاری رُوح کے ویرانے میں گونجتے رہیں گے، لیکن کیا ہوا تمہیں؟ یہ اُداسی تم نے کہاں سے پائی؟

پٹواری نے جیسے پرکاش کے دل کی بات سُن لی۔ کہنے لگا۔ بھئی آج تو جی نہیں چاہتا۔ سائیں کی حالت ہر روز بگڑ جاتی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔

چاچا پھیرو نے حقّہ آگے کر کے کہا۔ "حقّہ پیجئے۔ لالہ جی۔ ذرا دیکھئے اس وقت تو خوب چل رہا ہے۔"

پرکاش نے پوچھا۔ "لالہ جی۔ سائیں آپ کا لڑکا ہے؟ بڑا عجیب سا لڑکا ہے"

"عجیب؟" پٹواری نے آہستہ سے کہا۔ وہ تو پاگل ہے۔ جی۔ کیا بتاؤں۔ اس پر اکثر جنون کی کیفیت طاری رہتی ہے اور اول جلول بکنے لگتا ہے۔ ہمارے ہاں مسلمان تو اُسے فقیر سمجھتے ہیں اور اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات کو پتھر کی لکیر اور قصبے کی سب عورتیں سمجھتی ہیں کہ وہ کوئی بڑا عامل ہے اور ہر مرض کا علاج جانتا ہے اور یہ شیطان بھی جسے چٹکی اُٹھا کر دیتا ہے ایشور کی مرضی سے وہ بالکل بھلا چنگا ہو جاتا ہے۔"

"سچ مچ؟"

چونی لال نے کہا۔ ہاں میرا چھوٹا بھائی دس روز بخار میں مبتلا رہا، حکیم صاحب نے

بہتیری کوشش کی، لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ یہ سائیں گلی میں کھیل رہا تھا۔ میں اسے بلا لایا۔ اس نے اُسے دیکھتے ہی کہا "بھائی اچھا ہو جائے گا۔ بھائی ٹھیک ہو جائے گا۔ بھائی ٹھیک ہو جائے گا۔ کوئی فکر نہیں۔ کوئی فکر نہیں"___ اور دوسرے دن میرے چھوٹے بھائی کا بخار اُتر گیا۔

"کمال ہے!" پرکاش نے حیرانی سے کہا۔

پٹواری نے کہا۔ "یہ مسلمانوں کے گھروں میں جا کر سب کچھ کھا پی آتا ہے اسے ان باتوں کی بالکل تمیز نہیں۔ ڈپٹی صاحب اس سے بہت محبت کرتے ہیں جب ڈپٹی کا لڑکا قتل ہونے کو تھا۔ اِس نے اُنہیں پہلے ہی بتا دیا تھا۔

"بڑے تعجب کی بات ہے"۔ پرکاش نے کہا۔

پٹواری بولا۔ "اس سے پہلے میرے تین لڑکے تھے، وہ سب مر گئے۔ اب یہی بچہ میری آنکھوں کا نور ہے۔ اب میں کسی سے رشوت بھی نہیں لیتا۔ کسی کو بے جا تنگ نہیں کرتا۔ لیکن بھگوان کو نہ جانے کیا منظور ہے۔ پچھلے سال اس کا ایک چھوٹا بھائی پیدا ہوا تھا۔ اس نے ہمیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میرا بھائی آئے گا، پھر اس لڑکے کی پیدائش کے چند ماہ بعد اس نے ایک دن اپنی ماں سے کہا کہ آج میرے بھائی کی اچھی طرح حفاظت کرنا، اسے باہر لیکر نہ پھرنا،

اور نہ اُسے کوٹھے پر لیجاتا، اُس کی ماں نے ایسا ہی کیا۔"

وھن سیال نے بات پوری کرتے ہوئے کہا۔" ہاں اُسی دن وہ چھوٹے چھوٹے لڑکے کوٹھوں پر سے گر کر مر گئے۔"

پٹواری نے کہا، اور جب وہ چھوٹا بچہ بیمار ہؤا تو ہم نے سائیں سے کئی بار پوچھا۔ لیکن اس کمبخت نے زبان تک نہ کھولی۔ آخری رات، وہ رات مجھے اچھی طرح یاد ہے، سائیں کی ماں سو گئی تھی۔ چھوٹا بچہ بھی اس کی گود میں لیٹا سو رہا تھا۔ اور سائیں بھی اپنی چھوٹی چارپائی پر پڑا سو رہا تھا۔ اُس رات مجھے نہ جانے کیوں نیند نہ آئی اور میں بستر پر پڑا بہت دیر تک گنگناتا رہا۔

بزار وکیندا لاچا......

مٹی نہ پھرول جوگیا

مٹی نہ ٹول جوگیا

تیرا لبھنا نہیں لعل گواچا۔

مٹی نہ پھرول جوگیا

یکایک سائیں نے چیخ ماری اور اُٹھ کر کہنے لگا۔ لے گئے، لے گئے، میرے بھائی کو لے گئے، میں گھبرا کر بستر کی طرف گیا۔ جہاں بچہ سویا پڑا تھا۔ ہاتھ لگا کر

دیکھا۔ ہائے میرا بچہ مردہ اور بے جان اپنی ماں کی گود میں لیٹا ہوا تھا۔ وہ بے خبر سوئی پڑی تھی اور اس کے لال کو رات کے اندھیارے میں ایم راج کے دوت اُٹھا کر لے گئے تھے،........

شام کے وقت بیر کا بہنوئی ہرچندر اور پرکاش بیاس کے کنارے سیر کرنے کو گئے۔ ریتیلے ٹیلوں پر کہیں کہیں کیکر کے درخت اُگے ہوئے تھے اور اُن سے نیچے اُتر کر کھیت تھے۔ لیکن فصل کاٹی جا چکی تھی، اس لئے بالکل رو کھے سوکھے دکھائی دے رہے تھے۔ دریا کے کنارے کہیں کہیں سرکنڈے اُگ رہے تھے۔ اور کہیں کہیں کڑوے کسیلے بیروں کی جھاڑیاں۔ مرغابیوں کا ایک جھُنڈ مغرب کی طرف پَر پھیلائے جا رہا تھا۔ کنارے پر دو تین مچھوے بندھے ہوئے تھے۔ ہوا رُکی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور فضا میں سنّاٹا تھا۔ کہیں کہیں کوئی پرندہ چیخ اُٹھتا، اور دریا کی سطح پر دور ایک کشتی چلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ پرکاش نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اور حدِ نظر پر اس کی نگاہیں بڑھتے ہوئے اندھیرے میں مل گئیں۔ اس منظر میں کہیں بھی کوئی ایسا نقطہ نہ تھا۔ جسے وہ دلکش یا جاذبِ نظر کہہ سکتا۔ ایک عجیب سی غمناکی ایک عجیب سی ویرانی تھی جسے محسوس کر کے اس کا دل بیٹھا جاتا تھا، پرکاش نے ہرچندر

کی طرف دیکھا۔لیکن وہ خوش نصیب آدمی اپنے گردونواح کے ماحول سے بے خبر اور بے نیاز مزے سے داتن کیے جاتا تھا۔ داتن کرتے کرتے کہنے لگا۔ بھائی صاحب آپ ذرا بیر کو سمجھائیں نا!

"کیوں، کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے کہ لڑکا یوں تو سمجھدار ہے۔ کماؤ بھی ہے۔ لیکن روپے کی قدر نہیں جانتا۔"

"وہ کس طرح۔ میرے خیال میں تو......"

ہرچندر نے بات کاٹ کر کہا۔"آپ نہیں جانتے۔ اوّل تو وہ دوستوں کو بہت کھلاتا پلاتا ہے اور پھر اس شادی میں تو میں نے دیکھا ہے۔ وہ اندھا دھند روپیہ خرچ کر رہا ہے۔ جہاں دو روپے میں کام ہو سکتا ہے۔ وہاں یہ دس روپے خرچ کر دیتا ہے۔ بھلا اس طرح بھی کبھی گھر کے کام چلتے ہیں۔ اور پھر جب سے یہ چین سے واپس آیا ہے۔ ہر وقت گھر والوں کو جھڑکیاں دیتا رہتا ہے اور کسی بزرگ کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ یہ بات اچھی نہیں۔ کیا ہوا اگر وہ پچاس سو روپیہ مہینہ کما لیتا ہے آخر اس کے ماں باپ ہی نے تو اسے پڑھایا ہے۔ اگر انہیں کا کہنا نہ مانے، تو اس سے بڑھ کر احسان فراموش اور کون ہوگا۔"

"بے شک! بے شک!" پرکاش نے اپنی ناک کھجلاتے ہوئے کہا۔

"اب شادی کے معاملے ہی کو لیجیئے۔ پرکاش وتی کی شادی نہیں بلکہ اس کی اپنی۔ اس کی ماں چاہتی ہے کہ وہ اب اس کی منگنی کر دے۔ اور اس سال بیاہ بھی دے۔ لیکن اسے دیکھو یہ مانتا ہی نہیں۔ لالہ بسا کھامل کے ہاں سے ناطہ ملتا ہے۔ لڑکی سیانی ہے۔ گھر کے کام کاج سے واقف سوشیل سمجھدار، سینا پرونا جانتی ہے۔ خط پڑھ لیتی ہے۔ ماں باپ، بھائی بہنیں کسی میں کوئی نقص نہیں۔ شریف گھرانا ہے۔ کھتری گھر ہے۔ پرانا خاندان ہے۔ امیر آدمی ہیں۔"

"تو یہ مانتا کیوں نہیں؟"

"کہتا ہے۔ لڑکی ٹھنگنی ہے۔ سانولا رنگ ہے۔ آواز بھاری ہے۔ اور اپنی طرف لگاہ ہی نہیں۔ بڑے یوسف ثانی بنے پھرتے ہیں۔ کہتا ہے میں شہر کی لڑکی لاؤنگا جو دسویں پاس ہو اور شعر و شاعری سے مس رکھتی ہو۔ سینما کی تصویروں پر بات چیت کر سکے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اُسے کیا ہو گیا ہے۔ بڑا شریف لڑکا تھا۔ اسے خبر نہیں کہ آج کل زمانہ کیسا ہے۔ شریف گھرانے بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ اب پرکاش وتی کو دیکھو۔ گیارھویں پاس کر کے بھی کیا بنا، تعلیم عورتوں کے کس کام کی لڑکی تو وہی ہے جو گھر کا کام کاج اچھی طرح . . . جانے۔ اب ہم اسے کسی

بے کار گریجویٹ کے پلے باندھ دیتے تو بے چاری کی زندگی تلخ ہو جاتی۔ اسوقت تو اسے ان باتوں کی سمجھ نہیں لیکن بعد میں ہمیں دعائیں دے گی۔ پرکاش دتی تو خیر ایک لڑکی ہے۔ وہ ہمارے کہنے سے باہر نہیں جا سکتی۔ لیکن اب بیر کو کون سمجھائے۔ میں نے سوچا۔ بیر آپ کا کہا مانتا ہے۔ آپ سے کہوں گا۔ آپ اُسے سمجھا بجھا کر راہِ راست پر لے آئیں۔ تاکہ گھر برباد نہ ہو۔

اور پرکاش نے کہا کہ وہ اسے ضرور سمجھانے کی کوشش کرے گا۔ لیکن یہ ایک ذرا مشکل سی بات ہو گی۔ کیونکہ شادی زندگی کا محور ہے، اور پھر بیر تو شنگھائی کے کابرے CABRET بھی دیکھ چکا ہے اور شاید اُسے قرونِ وسطیٰ کی قسم کی شادی پسند نہ آئے۔ لیکن ہر چندر نے کہا نہیں آپ ضرور کوشش کریں، میری خاطر سے اور پرکاش نے کہا اچھا میں آپکی خاطر سے ضرور کوشش کروں گا۔ لیکن مجھے امید بہت کم ہے۔ ہر چندر نے کہا۔ جی نہیں۔ یہ آپ کیا کہتے ہیں؟ آپ اگر چاہیں تو اُسے سمجھا سکتے ہیں۔ بہت دیر تک اسی طرح کی بے معنی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ صرف ہر چندر داتن کرتے کرتے کبھی کبھی زور سے تھوک دیتا۔ دریا کی سطح پہ چلتی ہوئی کشتی اب بالکل کنارے کے قریب آ گئی تھی۔ اس میں چند کسان بیٹھے تھے جو پورب کے رہنے والے معلوم ہوتے تھے۔ ان کے نیچے اور

بیویاں اور لڑکیاں بھی ساتھ تھیں۔ وہ نہایت خاموشی سے بیٹھے تھے۔ بچے سہمے ہوئے تھے۔ عورتوں کے چہرے پژمردہ تھے، اور کسانوں کی آنکھوں میں چمک نہ تھی، اور اُن کی نگاہوں کی اوٹ میں ناامیدی جھانک رہی تھی۔ پرکاش نے سوچا، یہ میرا خیال ہی ہے۔ میں ہر جگہ اور ہر مقام پر یُوں ہی غم کی تلاش کرتا رہتا ہوں۔ ورنہ در اصل یہ معمولی سے چہرے ہیں عام کسانوں کے۔ ان کے دِلوں میں طمانیت ہے۔ صبر ہے یقین ہے۔ شاید یہ رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے کا دھوکا ہے کہ مجھے انکی صورتوں میں یاس کی جھلک نظر آتی ہے۔ شاید یہ میرے ہی دل کا عکس ہے، روح کا پرتو ہے۔ شام کے سناٹے، پھیکی فضا اور سائیں سائیں کرتی ہوئی ہوا کا اثر ہے۔

کشتی سے اُتر کر کسانوں اور ملاحوں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ ملاح اُونچی اُونچی آوازمیں گالیاں دینے لگے۔ پرکاش اور ہرجندر اُٹھ کر اس گروہ کے قریب چلے گئے۔ ہرجندر نے پوچھا "کیوں جھگڑتے ہو بھئی؟ کیا بات ہے؟"

ایک ملاح نے کہا "شاہ جی بات یہ ہے کہ ہم ان پوربیوں کو بیاس پار لائے ہیں۔ یہ دوسرے کنارے پر صبح کے بیٹھے تھے اور کوئی انہیں پار نہیں اُتارتا تھا۔ کیونکہ یہ پیسے پُورے نہیں دیتے تھے۔ کہنے لگے ہم حصار کے قحط کے مارے ہوئے

غریب کسان ہیں۔ ہمارے ڈھور ڈنگر مر گئے ہیں۔ ہماری کھیتیاں اُجڑ گئی ہیں۔ ہم پر رحم کرو۔ ہمیں بیاس پار کر دو۔ ہم نے کہا' اچھا تو سب آدمی ایک ایک پیسہ دے دو۔ ہم تمہیں بیاس پار لے چلتے ہیں۔ اب یہاں آکر یہ کل پندرہ پیسے دیتے ہیں اور یہ آدمی ہیں تحبیس ——— آپ خود گن لیجئے؟"

کسانوں نے کہا" ہم غریب ہیں۔ ہم قحط کے مارے ہوئے ہیں' ہم پر دیا کرو" بچے رونے لگے۔ عورتوں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

ایک ملّاح نے کہا' اور ہم کہاں سے کھائیں؟ سارے دن میں بیاس پار کتنے آدمی اُترتے ہیں؟ ان چند پیسوں میں بمشکل گذارا ہوتا ہے۔ ہم نے تمہیں دو دو پیسے فی آدمی چھوڑ دیئے۔ اب تم ایک ایک پیسہ بھی نہیں دیتے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟"

پرکاش نے دس پیسے ملّاح کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

ایک بوڑھے کسان نے آبدیدہ ہو کر کہا" بھگوان تمہارا بھلا کرے۔ یہ میرا کنبہ ہے۔ میں بھی کبھی مال مویشی والا تھا۔ میرا گھر پکّی اینٹوں کا بنا ہوا تھا: ابھی کل تک میری کھیتیاں لہلہاتی تھیں۔ میرے دوارے پر بھکاری بھیک مانگتے تھے' میری بہوئیں اور بیٹیاں آنگن میں گیت گاتی تھیں۔ آج وہ بَین کر رہی ہیں بھگوان!

میں نے ایسی بپتا کبھی نہ دیکھی تھی۔ اب دربدر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ کہیں سر چھپانے کو جگہ نہیں ملتی۔ پیٹ بھر کھانے کو روٹی نہیں ---- ایسا قحط میں نے اپنی ساری عمر میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ بھگوان! یہ کن کھوٹے کرموں کی سزا ہے؟"

برجندر نے کہا "تم ایک دو آدمی ہمارے ساتھ چلو۔ ہم تمہیں آٹا دال لون سب کچھ دیں گے۔"

بوڑھا کسان بولا "پرماتما تمہارا بھلا کرے۔"

ایک بوڑھی عورت بولی "اری لڑیا! جا سرکنڈے گھاس پھوس اور لکڑیاں اکٹھی کر لے۔ ساری تنبو الحاف اور چٹائیاں اور برتن مچھوے سے اُتار کر ادھر لے آ۔ ارے سادھو اکبخت کدھر بھاگ گیا تو......"

لڑیا اٹھی اور سرکنڈوں کے جھنڈ کی طرف چلی۔ وہ ایک سانولے رنگ کی جوان عورت تھی۔ پرکاش نے دیکھا اس کی چولی اور لہنگا جگہ جگہ سے پھٹ رہا تھا۔ اور وہ چلتے چلتے اپنی جوانی کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ لیکن غریبی میں نہ تو غریبی ہی چھپتی ہے اور نہ جوانی......

دریا سے واپس آ کر پتہ چلا کہ بارات دوسرے دن شام کو سری پور پہنچ جائیگی

لڑکے والوں کا نائی آیا تھا۔ اور اب وہ ایک بڑی سی گلابی رنگ کی پگڑی باندھے آنگن میں لکڑی کے تخت پوش پر بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا۔ اس خبر نے گھر والوں کو چونکا سا دیا، برات آئیگی، یہ بھی سب جانتے تھے لیکن یہ جانتے ہوئے بھی دل میں ایک واہمہ سا تھا۔ لیکن اب وہ واہمہ دور ہوگیا اور اب اس کی جگہ ایک اضطراب، ایک عجیب قسم کی بے چینی اور عجلت نے لے لی۔ چاچا پھیرو جو قصبے میں حلوائی کی دکان کرتے تھے اور پینتالیس برس گذر جانے پر بھی مجرد تھے۔ دوڑتے ہوئے لاریوں کے اڈے پر گئے تاکہ کل کے لئے پٹیالے سے برف منگوانے کا انتظام کریں منگت رائے اور ہر چند رکو برات گھر میں صفائی کروانے، برات گھر کو سجانے اور براتیوں کے لئے چارپائیاں بچھوانے کا کام سپرد ہوا۔ گھر میں آئی ہوئی عورتوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ اور ساڑھیوں اور قمیصوں کے رنگ شوخ تر ہونے گئے۔ بیر اپنے باپ کی چھڑی جس پر چاندی کا دستہ تھا، لیکر ادھر اُدھر گھومنے اور جھیوروں کو چستی سے کام کرنے کی ہدایت کرنے لگا، بیٹھک میں اب صرف پرکاش اور چونی لال اور بوٹا سنگھ رہ گئے۔ پرکاش کھڑکی سے اُن عورتوں کی طرف دیکھنے لگا۔ جو گھر کے بڑے دروازے سے اندر آرہی تھیں۔ یا باہر جارہی تھیں۔ ریشمیں لباس، سرسراتے ہوئے قمیصیں جن پر سنہری پھول بوٹے بنائے گئے تھے۔ چنریاں جن پر تقیش کے لہریئے تھے۔ پھر

کبھی کبھی ان میں کوئی خوبصورت چہرہ بھی نظر آجاتا۔ یوں ہی قصباتی سا حسن جس میں رعنائی اور موہنی کی بجائے جوانی اور الھڑپن کی آمیزش زیادہ ہوتی۔ یکایک چونی لال اور بوٹا سنگھ نے ایک ساتھ دبی سی چیخ ماری۔ سامنے دو لڑکیاں جا رہی تھیں۔ نیلون کے بادامی دوپٹوں میں اُن کی چوٹیاں کالی ناگنوں کی طرح بل کھاتی ہوئی تھیں اور ایک کی گردن کے خم میں مدراکے مندر لٹکے ہوئے نظر آرہے تھے۔ پرکاش کا چہرہ شرم سے سُرخ ہو گیا۔ اُسے یہ خیال نہیں رہا تھا۔ کہ کوئی اُس کی بہنوں کو دیکھ کر خوشی سے چیخیں مار سکتا ہے۔ سوشیلا اور لیلا گلی میں چلتے چلتے ٹھٹھک کر رہ گئیں۔ اب مخالف سمت سے دو اور نوجوان اور حسین لڑکیاں آرہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر بوٹا سنگھ کے منہ سے پھر بے اختیار ایک دبی سی چیخ نکل گئی۔ ان دو نوجوان لڑکیوں میں سے ایک تو وہی دوشیزہ تھی جس نے بیر کو اور پرکاش کو لسی پلائی تھی۔ پرکاش نے پوچھا "وہ کون ہے؟"

"وہ کون؟" چونی لال نے پوچھا۔

وہ جو آسمانی رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئے شرما سی رہی ہے اور مسکرا بھی رہی ہے اور......

چونی لال نے کہا۔ وہ! ......وہ مس اوور سیئر ہے اور یہ کہہ کر چونی لال اور

بوٹا سنگھ دونوں ہنسنے لگے۔

"مس اوورسیئر؟"

"ہاں، ہاں" بوٹا سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا" اس کا باپ نہر کے محکمے میں اوورسیئر ہے نا!"

چونی لال نے بوٹا سنگھ کی طرف دیکھ کر رازدارانہ لہجے میں کہا"میں نے سنا ہے کہ اوورسیئر کی تبدیلی جالندھر ہوگئی ہے اور اب وہ دو تین دن میں یہاں سے چلے جائیں گے......"

"سچ مچ؟"

"ہاں۔مجھے آج ہی پتہ لگا ہے، ایک بڑے معتبر آدمی سے۔لیکن یہ بات کسی کو بتانا نہیں۔اگر اُس نے سن لیا تو بس بے چارے پر قیامت گذر جائے گی۔"

"نہیں، نہیں...... آہ بے چارہ۔" اتنا کہہ کر بوٹا سنگھ ہنسنے لگا۔چونی لال بھی اس کی ہنسی میں شامل ہوگیا۔پر کاش نے سوچا، یہ لڑکے کیسے بدمذاق اور بے تربیت ہیں، بالکل دیہاتی۔وہ بیٹھک سے اُٹھ کر گھر کے آنگن میں چلا گیا۔آنگن میں دری بچھ گئی تھی۔ایک دیوار کے ساتھ گیس لیمپ لگ گیا تھا۔اور کم سن لڑکیوں نے ابھی سے ڈھولک بجانی شروع کر دی تھی......

کتھے گیوں! پردیسیا وے!

ٹنک، ٹنک، ٹنک، بجتی ہوئی ڈھولک پر ایک لڑکی پتھر کے ایک ٹکڑے سے تال دے رہی تھی، پرکاش نے سوچا ان ناداروں کو پتہ نہیں کہ وہ کیا گا رہی ہیں۔ پردیسی سے پیار کیوں؟ اُس نے دیس دیس کے گیت سُنے تھے۔ بلوریں چشموں کے کنارے نیلی آنکھوں والی چرواہنوں کے گیت، اور ڈرائنگ روم میں ارغنوں پر گیت، جہاں گلدان میں لمبی لمبی ڈنڈیوں پر نرگس کے پھول جھکے ہوئے تھے۔ گیت جو دوپہر کی تپتی ہوئی اُداسی میں گائے گئے۔ جب فضا میں پیپل کے پتے کھڑکھڑا رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ گیت......

لیکن حیرانی کی بات تو یہ تھی کہ عورت کے ہر نغمے میں پردیسی کے لئے پیار موجود تھا یہ پیار کبھی تو مدھم سروں میں لرزنے لگتا، اور کبھی اُس کی گویائی کی حس اتنی شدید ہو جاتی کہ وہ نغمے کے اُبھاؤ میں ایک زخمی پرندے کی طرح چیخ اُٹھتا، لیکن پردیسی کے لئے اِس قدر تڑپ کیوں؟ پرکاش نے پوچھا اور اُسے خیال آیا کہ یہ نغمہ انسان کی فطرت کا نغمہ تھا۔ وہی نغمہ جس نے دُور کی ہر شے کو پیاری بنا دیا تھا، جس نے بچپن میں اُسے چاند کی طرف ہاتھ بڑھانے پر مجبور کر دیا تھا اور بڑا ہونے پر اُسے بے قرار کر دیا تھا کہ وہ جنگلوں، پہاڑوں اور میدانوں کی خاک چھاننے اور قدرت

کو اپنا رازدار بنائے۔ یہ وہی انسانی فطرت کا نغمہ تھا جو ابھی تک عورت کی مقدس روح میں بے قرار تھا، یہ اچھا ہے۔ پرکاش نے سوچا کہ غلام ہوتے ہوئے بھی عورت کے دل میں پردیسی کی چاہ موجود ہے۔ کیونکہ عورت زمین کی طرح ہے۔ وہ زندگی کی تخلیق کرتی ہے اور جس دن اس کے دِل سے پردیسی کی چاہ اُٹھ گئی، انسانیت بھی فنا ہو جائے گی..... ٹِک ٹِک ٹِک، لڑکیوں نے ایک نیا گیت شروع کیا تھا

اُونہوں لکھنا!

اساں پردیسیاں نوں یاد رکھنا

پرکاش نے سوچا ان معصوم لڑکیوں کو پتہ نہیں کہ وہ کیا گا رہی ہیں کسی پردیسی کو یاد رکھنے کے لئے ایک حسّاس اور دردمند دل چاہیئے، جوانی کی بے قرار روح نسائیت اور شباب، اور اس کی نگاہوں میں پگڈنڈی پہ چلتی ہوئی عورت کی تصویر کھنچ گئی، جس کے سر پہ سرسوں کی سبز کونپلوں کا گٹھا تھا اور جس کی سبز قمیص پہ نقرئی فیتہ چمک رہا تھا۔

اساں پردیسیاں نوں یاد رکھنا

ٹِک، ٹِک، ٹِک، پرکاش کو ایسا معلوم ہوا گویا کوئی اس کے بجھتے ہوئے دل پہ اُسی پتھر کے ٹکڑے سے ضربیں لگا رہا تھا۔ ٹِک ٹِک ٹِک، اور وہ سیڑھیوں کی

طرف دوسری منزل پر جانے کے لئے مڑا۔ سیڑھیوں کے درمیان اُس نے بیرؔ اور مس اوورسیئر کو دیکھا جو ایک دوسرے کے قریب کھڑے تھے۔ بیرؔ کا چہرہ سفید تھا اور مس اوورسیئر کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ پرکاش جلد جلد زینے پر چڑھ گیا۔ بیرؔ نے آہستہ سے کہا۔ بھائی جان میں بھی اُوپر آرہا ہوں۔ ابھی...... دوسری منزل میں ایک بڑے کمرے میں بہت سی لڑکیاں پرکاش دتی کو گھیرے ہوئے تھیں وہ دبے دبے قہقہوں اور میٹھی میٹھی سرگوشیوں کے ساتھ پرکاش دتی کو دولھا بھائی کی آمد کے قصّے سُنا کر اُسے چھیڑ رہی تھیں اور اپنی دبی ہوئی جنسی خواہشوں کی ناکام تکمیل کر رہی تھیں۔ پرکاش چند کو کمرے میں آتے دیکھ کر ساری مجلس درہم برہم ہوگئی۔ کئی لڑکیاں کھلکھلا کر ہنستی ہوئی اور ہنسنے کے باوجود بھی شرماتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ اور دل نے جرأت سے کام لیکر اُسے اپنے نسوانی مزاح کا نشانہ بنانا چاہا۔ اتنے میں بیرؔ آگیا اور آکر ایک کونے میں پڑی ہوئی چارپائی پر چپ چاپ لیٹ گیا، اس کا چہرہ سپید اور سُتا ہُوا تھا اور اُس کے بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ شاید اُسے ابھی غش آنے کو ہے۔ بہت سی لڑکیوں نے دیکھا اور اندازہ لگایا کہ کوئی غیر معمولی بات ہے۔ اور وہ کمرے سے باہر چلی گئیں۔ پرکاش اور پرکاش دتی دونوں جلد جلد بیرؔ کے پاس گئے۔ پرکاش دتی نے

اپنا ہاتھ بیرؔ کے ماتھے پر رکھا۔ کہنے لگی۔ ماتھا گرم ہے۔

پرکاش نے پوچھا۔ کیا بات ہے۔ بیر؟"

بیرؔ نے رُکتے رُکتے کہا: "اُف ..... کوئی بات نہیں۔ بس دم گھٹا جا رہا ہے"

پرکاش نے کہا: "پانی، پانی"

پرکاش وتی نے گھبرا کر کہا: "پانی، پانی"

باہر کئی لڑکیوں نے چیخ کر کہا: "پانی، پانی"

سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔ پانی، پانی۔ بیرؔ کی ماں دوڑتی ہوئی اُوپر آئی اور ایک چھوٹے سے گلاس میں پانی اور گلاب ملا کر لائی۔ بیرؔ نے تھوڑا سا پانی پیا اور کہا میں اب اچھا ہوں۔ کوئی بات نہیں لیکن کسی نے اُس کی ایک نہ سُنی۔ کوئی ماتھا دبانے لگا۔ کسی نے ہاتھ پکڑ لئے۔ کسی نے پاؤں۔ کسی نے کہا کھڑکی بند کر دو، ہوا لگ جائے گی۔ کسی نے کہا کھڑکی کھول دو، ہوا لگنے دو۔ ایک پھوپھی جان بولیں۔ اسے دودھ میں گرم گھی ملا کر پلاؤ۔ پلایا گیا، دوسری پھوپھی جان بولیں۔ اسے ہے۔ کہاں ہے بیرؔ کی ماں؟ بیرؔ کی ماں!

بیرؔ کی ماں بولیں "میں تمہارے پاس ہی تو کھڑی ہوں"

"اُچھا۔ اچھا۔ جا بھاگ کر نیچے سے بادام روغن لا"

ببیر کی ماں نچلی منزل سے بادام روغن لانے گئی تو خالہ بھاگونتی اُس کے پیچھے دَوڑیں۔ اُف..... اُف..... میں کہتی ہوں، ببیر کی ماں، اُس کے تو ہاتھ پاؤں پُھنک رہے ہیں۔ بازار سے کانشی پھل منگواؤ۔ تاکہ پیروں پہ اچھی طرح مالش کریں اور گرمی چھُٹے۔ اُسے گرمی ہے اور کچھ نہیں۔ ببیر نے لاکھ اِنکار کیا کہ اُسے گرمی نہیں تھی، محض دم گھُٹا جا رہا تھا، اور اب وہ بھی نہیں گھُٹتا تھا، اب اُسے آرام تھا، لیکن کسی نے اس کی ایک نہ مانی اور اُسے آرام سے لیٹے رہنے کو کہا۔ ناچار ببیر نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

کوئی آدھ گھنٹہ شور وغل کرنے، ببیر کا سر سہلانے اور اس کے پاؤں اور ہاتھوں پر کانشی پھل کی مالش کرنے کے بعد گھر کی عورتوں کی جان میں جان آئی، اور وہ اُسے چارپائی پہ آرام سے سویا ہوا چھوڑ کر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد فوراً ببیر نے آنکھیں کھول کر کہا۔

"ہائے بھاپا جی"

پرکاش چند نے مسکرا کر پوچھا "چین کیسا ملک ہے؟"

ببیر نے کہا۔ "ہائے میں مر جاؤں گا، اب کیا ہوگا؟ ان کی تبدیلی ہوگئی ہے"

پرکاش چند نے کہا "سُنا ہے شنگھائی میں بہت دل پسند کاروبار ہیں اور

انیگلو چینی عورتیں......"

بیَر نے کہا۔" میں اس کے بغیر نہیں جی سکتا۔"

پرکاش نے کہا۔" اور چین کے لوگ چینی برتن بنانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے..."

بیَر نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔" ہائے۔ بھا پا جی۔ ہائے بھا پا جی۔ اگر تمہیں پتہ ہوتا

اگر تمہیں پتہ ہوتا......"

پرکاش نے کہا۔" مجھے سب پتہ ہے۔" اور وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

کمرے کے باہر سیڑھیوں کے قریب کونے میں اُس نے ایک لڑکی دیکھی۔

اُس نے آسمانی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ چُپ چاپ کھڑی تھی۔ اس کی ناک سُرخ تھی۔ اور آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی۔ پرکاش نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اُس لڑکی نے اپنا چہرہ ساڑھی کے پلّو میں چھُپا لیا۔ اور دیوار سے لگی لگی سسکیاں لینے لگی۔

یکایک پرکاش نے سوچا۔ کل پرکاش وتی کی شادی ہے۔

شادی کی رات پرکاش پل بھر کے لئے بھی نہ سو سکا۔ اُس نے بیَر کی ماں سے کہہ سُن کر چارپائی دوسری منزل میں رکھوالی تھی۔ تاکہ آرام سے سو سکے۔ بیَر کی ماں نے

نہایت چاؤ سے پوچھا تھا۔"بٹیا شادی نہیں دیکھو گے؟" اور پرکاش نے بیرؔ کی ماں سے کہا کہ وہ دو تین بجے کے قریب جب بیاہ کی رسمیں ادا کی جائیں گی، چارپائی سے اٹھ کر نیچے آنگن میں چلا آئے گا۔ لیکن اُسے تو دو تین بجے تک بھی کسی نے سونے نہ دیا، کوئی آٹھ بجے کے قریب چونی لال، دھن سیال، بوٹا سنگھ ہنستے ہوئے اور آنگن میں پھرتی ہوئی عورتوں کو تاکتے ہوئے اُوپر کی منزل میں آ گئے۔

چونی لال نے آتے ہی پرکاش سے کہا۔"بھائی صاحب آپ نے بہت اچھا کیا کہ آج رات کے لئے چارپائی یہاں رکھوالی۔ اب یہاں ساری رات بیٹھ کر کھڑکی میں سے نیچے آنگن کا تماشا دیکھئے۔"

پرکاش نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔"میں سونا چاہتا ہوں۔"

بوٹا سنگھ ہنسنے لگا تو۔"سونے کے لئے آپ نے اچھی جگہ تلاش نہیں کی۔"

دھن سیال نے کہا۔"آج ہمارے قصبے میں دو شادیاں ہوئیں۔ آج کا دن بہت مبارک ہے۔"

پرکاش نے پوچھا۔"دوسری شادی کس کے ہاں ہوئی؟"

دھن سیال نے مسکرا کر کہا۔"اوہ! آپ کو پتہ ہی نہیں؟ ...... یہاں بہت سے لوگوں کو ابھی پتہ نہیں اور آپ تو نو وارد ٹھہرے۔ کل جب پرکاش دتی کی ڈولی

جائے گی تو آپ بھی شاید ڈودلی جانے کے ایک دو دن بعد چلے جائیں گے۔ آپ کو ہمارے قصبے کی شادیوں سے کیا دلچسپی؟ ...... لیکن میرے خیال میں آپ کو بتا دینا چاہیئے۔ چاچا پھیرو کی شادی ہوئی ہے۔ چاچا پھیرو کو جانتے ہیں نا؟ دُبلے پتلے، لمبے قد کے آدمی، وہ اُس دن بیٹھک میں بیٹھے حقّہ پی رہے تھے۔ میلی سی مونچھیں، کھچڑی سی داڑھی۔ رخساروں پر چھائیاں"۔

"وہ جو بازار میں حلوائی کی دُکان کرتے ہیں؟" پرکاش نے پوچھا۔

"ہاں، ہاں، وہی جو مٹھائی بنانے کے علاوہ سوڈا واٹر بھی تیار کرتے ہیں۔ اور تمباکو بھی بیچتے ہیں۔ بچارے مجرّد تھے ابھی تک۔ عمر چالیس برس سے اُوپر ہوگئی اور غریبی کی وجہ سے ہماری برادری میں کوئی انہیں رشتہ نہیں دیتا تھا۔"

"یہ تو بہت اچھی خبر سنائی تم نے۔ چاچا پھیرو کی شادی، آج کا دن واقعی بہت مبارک ہے۔"

چونی لال، دھن سیال اور بوٹا سنگھ ایک ساتھ ہنس پڑے۔ "ہم ابھی چاچا پھیرو کو مبارک دیکر آ رہے ہیں۔ وہ بہت خوش تھے۔ انہوں نے داڑھی منڈوا دی ہے اگرچہ مونچھیں بدستور میلی ہیں اور ہونٹوں کے کونوں میں گرتی ہیں۔ انہوں نے ہمیں تازہ مٹھائی کھلائی اور کہنے لگے۔ ابھی اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا اور ہمیں بھی تو اچانک ہی پتہ

چل گیا۔

پرکاش نے پوچھا "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

چونی لال بولا "ہم دریا پر گئے تھے، جہاں حصار کے قحط زدہ لوگ ڈیرے ڈالے پڑے ہیں۔ وہاں بہت شور و غل تھا۔ بچے بلک رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں رو رہی تھیں اور ایک بوڑھی عورت اپنے خاوند کو صلواتیں سنا رہی تھی۔ ہائے ری میری لاڑیا، میری جوان اور سندر لاڑیا، پتہ چلا کہ بوڑھے کسان نے دو سو روپے کے عوض لاڑیا کو چاچا پھیرو کے حوالے کر دیا تھا۔ پیٹ بُری بلا ہے اور اب وہ بے وقوف بوڑھی عورت اپنے خاوند کو کوس رہی ہے۔ گویا حصار کے قحط کا ذمہ دار اس کا خاوند ہے!"

بوٹا سنگھ بولا "چاچا پھیرو بہت خوش نظر آتے تھے۔ انہوں نے اپنی دکان میں مٹھائی کے تھالوں کے پیچھے ایک میلی سی چادر لٹکا دی ہے۔ تاکہ پردہ رہے اور آنے جانے والوں کی نظر نہ پڑے۔

دھن سیال نے کہا۔ دیکھئے بھائی صاحب اس کا ذکر کسی سے نہ کیجئے۔ چاچا پھیرو نے کہا ہے اور اگر انہیں پتہ لگ گیا کہ ہم نے کسی آدمی کو یہ بات بتا دی ہے۔ تو پھر وہ ہم سے ساری عمر بات نہیں کریں گے اور نہ اپنی دکان سے ہمیں مٹھائی کھلائیں گے،

اور قصبے میں ان کے سوا یہاں کوئی دوسرا حلوائی بھی نہیں۔ یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔ پھر چونی لال اور بوٹا سنگھ بھی اس کی ہنسی میں شریک ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد چونی لال نے کہا۔ آؤ۔ بھاپا جی! ذرا بارات گھر میں باراتیوں کے درشن کر لیں۔ اور ان کے قیام و طعام کے متعلق انتظامات کی بھی دیکھ بھال کریں۔ بچارے کل یہاں سے رخصت ہو جائیں گے..... کہیں انہیں یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ سری پور گئے تھے اور وہاں اُن کی اچھی طرح خاطر مدارات نہیں ہوئی۔

باراتیوں کو کھانا کھلا کر کوئی دو ڈھائی گھنٹے کے بعد پرکاش فارغ ہوا۔ اور آتے ہی چارپائی پر دراز ہو گیا۔ لیکن نیند کہاں۔ آج شادی کی رات تھی۔ ابھی ابھی ان لوگوں نے دولہا کا منہ دیکھا تھا اور تیر کی ماں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی بلائیں لی تھیں۔ "سروارنا" کیا تھا اور چاندی کی چونیاں نچھاور کی تھیں۔ عورتوں نے سہاگ کے گیت گائے تھے اور کنواری لڑکیوں کی چھاتیاں زور زور سے دھڑکنے لگی تھیں دولہا کا چہرہ پرکاش نے بھی دیکھا تھا، بالکل ایک ہلدی کی گانٹھ کی طرح تھا، وہی زردی، وہی تلخی، وہی سختی اور سہرے کے زریں تار اور چمپا کی کلیاں بھی اس کے رنگ روپ میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکی تھیں۔ اس کے ساتھ اُس کا بڑا بھائی بھی آیا تھا۔ اس کی ناک چپٹی تھی۔ ہونٹ موٹے، اور رخساروں کی ہڈیاں باہر کو نکلی

ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں روپوں سے بھری ہوئی لال کپڑے کی ایک تھیلی تھی۔ جسے لیکر وہ ادھر اُدھر اس طرح گھوم رہا تھا۔ جیسے وہ اس سارے قصبے کا مالک ہو۔ اس کے ساتھ اس کا باپ بھی تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی وہی چالاکی اور بنیاپن تھا جس کی بدولت وہ جلدی جلدی لکھ پتی بن گیا تھا۔ ان کے ساتھ ان کے بہت سے رشتہ دار تھے، جن کے حلیئے ایک دوسرے سے بہت ملتے تھے۔ کیونکہ جلدی کی جڑ تو آخر ایک ہی ہوتی ہے۔ گانٹھیں چاہے کتنی بنتی چلی جائیں!...... "ملنی" کے وقت لڑکی والے اور لڑکے والے آپس میں بھینچ بھینچ کر گلے ملے تھے چاندی کے گلاب دانوں میں بھرا عطر پانی ایک دوسرے پر چھڑکا گیا تھا۔ جھیوروں، بھانڈوں اور میراسیوں نے بدھائی کے ترانے گائے تھے اور گداگروں کے جم غفیر نے گلی کے دونوں طرف ناکہ بندی کر لی تھی، تاکہ جب فریقین کی طرف سے تانبے کے پیسے نچھاور کئے جائیں تو گلی کی سُرخ اینٹوں پر پیٹ رگڑ رگڑ کر اور گندی موریوں میں ہاتھ ڈال ڈال کر انہیں لوٹا جا سکے پیسوں کے نچھاور ہوتے ہی چھوٹے بڑے گداگر سب ایک دوسرے پر پل پڑے تھے اور وہ فقیرنی جس کی چھاتیوں سے ایک سُوکھا ہوا بچہ لٹک رہا تھا اور وہ بوڑھی بھکارن جس کے بال بڑ کی شاخوں کی طرح تھے۔ ایک پیسے کے لئے ایک دوسرے سے گتھم گتھا

ہوگئی تھیں۔ لڑکا چلانے لگا تھا، اور میراسی بدھائی کے گیت گا رہے تھے۔ کیا یہ شادی کی بدھائی تھی؟ یا سماج کے جنازے کا نوحہ یا کسی نے اپنے گھر کو آگ لگائی تھی، اور اب بھڑکتے ہوئے شعلوں کو دیکھ کر خوشی سے ناچ رہا تھا،.....

کوئی پرکاش کے قریب بستر پر بیٹھ گیا۔ پرکاش چونک پڑا۔ یہ پرکاش وتی تھی۔ وہ چپ چاپ آکر اس کے پاس بیٹھ گئی اور وہ دونوں نیچے آنگن میں کام کرتی ہوئی عورتوں کی طرف دیکھنے لگے۔ آنگن کے بیچ میں کاٹھ کی بیدی کھڑی کی گئی تھی۔ درمیان میں ہون کنڈ تھا۔ کاٹھ کی بیدی مندر کی طرح بنائی گئی۔ ایک چھ پہلو کی عمارت جو اوپر اٹھ کر ایک تکون کی صورت اختیار کرلیتی تھی۔ اسے پھولوں، کیلے کے پتوں اور زریں تاروں سے سجایا گیا تھا۔ بیدی کی چوٹی پر لکڑی کے سبز رنگ کے طوطے سے لٹکائے گئے تھے۔ اور آنگن کی دیواروں پر ریشم سے کاڑھی ہوئی سرخ پھلکاریاں لٹکائی گئی تھیں۔ ان پر آدم کے قطعے اور گائتری اور دیگر متبرک منتر کاڑھے ہوئے تھے۔ آنگن کے آرپار جھنڈیاں لگائی گئی تھیں اور فرش پر لکیروں والی دریاں بچھائی گئی تھیں۔ پرکاش نے پرکاش وتی سے کہا، آج تمہارا بیاہ ہے، دیکھو بیدی کتنی خوبصورت بنائی گئی ہے، بالکل مندر سے ملتی جلتی ہے، لیکن پجاری ابھی نہیں آئے اور جب پجاری آجائیں گے

تو تمہیں نئے کپڑے پہن کر ایک دیو داسی کی طرح اپنے مندر کے دیوتا کو رجھانے کے لئے ناچنا ہوگا، اور تم تو بہت اچھا ناچ سکتی ہو، کیوں؟"

پرکاش وتی نے نمناک لہجے میں کہا۔ "نہیں"۔ میں آج ذبح کی جاؤں گی..... خبر نہیں، پڑھا لکھا کر اور ہر طرح کے عیش و آرام دے کر ہمیں ماں باپ کیوں ذبح کر ڈالتے ہیں۔ شاید یہ بھی ایک رسم ہو گی۔ لیکن میں سوچتی ہوں کیا مجھے اسی لئے مہا ودیالہ میں داخل کرایا تھا..... میرا جی بھرا ہوا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ چیخیں مار مار کر روؤں..... مجھے تم سے ہمدردی کی امید تھی اور تم ہو کہ جب سے آئے ہو ہر وقت جی جلاتے رہتے ہو"۔

پرکاش نے کہا۔ "بہن پرکاش وتی جی! جی جلانے کو تو ساری عمر پڑی ہے، اب اگر ہنس کر بھی تم نے اپنے غم کو نہ چھپایا تو تمہاری شاعری کس کام کی"

"بھاڑ میں جائے شاعری"، پرکاش وتی نے جھلا کر کہا۔

"وہ تو اب خود بخود چلی جائے گی"۔

پرکاش نے پرکاش وتی کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور پھر اس کی ہتھیلی پر انگلی رکھ کر بولا، تمہاری قسمت یہاں لکھی ہے۔ دیکھو یہ لکیر ظاہر کرتی ہے کہ تم بہت لمبے عرصے تک جیو گی۔ تمہارے دس بچے ہوں گے اور ایک

موٹر کار، یہ لکیر تمہاری شاعری کی تھی۔ لیکن یہاں آکر شاعری کا آبگینہ ہلدی کی ایک گانٹھ سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔ یہ لکیر ظاہر کرتی ہے کہ تمہارے خاوند کو تم سے بہت محبت ہو گی۔ یوں بھی تو یہ محبت دس بچوں سے صاف ظاہر ہے، لیکن ان کے علاوہ وہ تمہیں ہر سال نئے بھدّے زیور اور ریشمیں کپڑوں کے بھاری بھرکم جوڑے سلوا دیا کرے گا۔ شادی کے پانچ سال بعد تم اتنی موٹی ہو جاؤ گی کہ خود تمہاری ماں بھی تمہیں پہچان نہیں سکے گی۔ اور......"

پرکاش وتی نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے جلدی سے کہا "ہٹو بھی۔ ہر وقت بے ہودہ مذاق۔ شرم نہیں آتی تمہیں۔"

پرکاش نے اُسے چھیڑتے ہوئے کہا "معلوم ہوتا ہے۔ تیر نشانے پر بیٹھا ہے میں جانتا تھا کہ عورت ایک ہلدی بیچنے والے سے شادی کر کے خوش رہ سکتی ہے لیکن اپنے موٹاپے کا ذکر سُن کر خائف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

یہ آخری رتجگا تھا۔ بیاہ کی رسمیں دو بجے کے بعد ادا کی جانی تھیں، اس لئے قصبے کی سب عورتیں اپنے بہترین لباس اور زیور پہن کر آئی تھیں۔ ڈھولک پر اتنے زور سے ہات پڑتا تھا کہ پرکاش کو اس کی دھب دھب سمع خراش

معلوم ہونے لگی۔ ہر ایک عورت اپنے گلے کی پوری قوت سے گا رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں بیچ بیچ میں زور سے چلّا اُٹھتے تھے۔ نائنیں شربت پلاتی جاتی تھیں اور دوسری منزل پر پرکاش کے پاس قصبے کے بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکی والوں کے رشتہ دار اکٹھے ہو گئے تھے اور کھڑکیوں میں سے جھانک جھانک کر رتجگے کا نظارہ کر رہے تھے۔ کئی لمبی لمبی داڑھیوں والے بزرگ بھی آ گئے تھے جو حقّہ پیتے، بار بار کھانستے اور نوجوانوں کو شرافت کی تلقین کرتے ہوئے اپنی آنکھیں سینکتے جاتے تھے۔ پرکاش نے اُن کی آنکھوں میں دبی ہوئی حسرتیں دیکھیں۔ جو اب اپنی قبروں سے باہر جھانک رہی تھیں۔ جنہوں نے آج تک زندگی کو گناہ سمجھا تھا اور اُسے ہر جگہ اور ہر مقام پر اپنی روح کی پوری قوت سے دبانے کی کوشش کی تھی۔ اُن سے آج زندگی انتقام لے رہی تھی، کیونکہ جسم مر چکے تھے لیکن حرص تیز ہو گئی تھی۔ اور حقّہ پینے والے بزرگ اب اس راکھ کے ڈھیر کو کرید رہے تھے، جہاں زندگی کی ایک چنگاری بھی باقی نہ تھی ——— شاید اگر بات یہیں تک رہ جاتی تو پرکاش کو چنداں افسوس نہ ہوتا۔ لیکن اُسے تو رہ رہ کر غصّہ آ رہا تھا۔ ان سفید داڑھیوں والے بزرگوں پر جن کی جوانیاں مدّت سے راکھ ہو چکی تھیں اور جو اب دوسروں کی جوانیاں راکھ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ جنہوں نے

اپنی جنسی آلودگیوں پہ شرافت کا پردہ ڈال لیا تھا، اور اب اس جھوٹی شرافت کے بل بوتے پر اپنے جوان لڑکوں اور پوتوں سے کھوئے ہوئے لمحوں کا انتقام لے رہے تھے، پرکاش نے سوچا۔ کیسی بے انصافی ہے! ہم لوگ بچپن ہی میں بوڑھے کر دیئے جاتے ہیں۔ ساری زندگی روتے گذرتی ہے اور پھر وہی بسورتے ہوئے چہرے لیکر قبر میں جا داخل ہوتے ہیں۔ لیکن اس وقت آنگن میں تو لڑکیاں خوب زور زور سے گا رہی اور قہقہے لگا رہی تھیں۔ پرکاش کو یہ ڈر تھا کہ ابھی کوئی بزرگ صورت آدمی کھڑکی میں سے جھانک کر کہہ دے گا۔ لڑکیو! اتنا غل کیوں مچا رکھا ہے اور رتجگے کی سب رونق ماند پڑ جائے گی۔ اور چلاتے ہوئے گلے اس طرح خاموش ہو کر رہ جائیں گے جیسے موت کے سرد اور برفیلے ہاتھ نے انہیں زور سے گھونٹ دیا ہو۔ بے چاری عورتوں کو تو آج ہی مدت کے بعد اپنے دبے ہوئے ارمانوں کو ذرا ڈھیل دینے کا موقع ملا تھا۔ وہ اس قدر فحش، لچر اور بازاری گیت گا کر بہت مسرور ہو رہی تھیں۔ گیت کیا تھے سیدھی سادی جنسی گالیاں تھیں جن میں ماں باپ، بہنوں بھائیوں، بہوؤں اور آشناؤں کے جائز اور ناجائز تعلقات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا تھا۔ وہ عورتیں جنہیں پرکاش شرم و حیا کی پتلیاں سمجھتا تھا۔ اب سب سے اونچی آواز میں سب سے گندے

گیت گا رہی تھیں اور اُن کے ننگے سر اور لہراتی ہوئی چوٹیاں دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں۔ لیکن ایسے موقعے تو بہت کم آتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی شادی ہوتی ہے۔ ورنہ کئی سال گذر جاتے ہیں اور ان عورتوں پر شرم وحیا کا جھوٹا ملمع چڑھا رہتا ہے اور پھر جب وہ بوڑھی مائیں اور ساس بن جاتی ہیں تو اپنا سارا غصہ اپنی لڑکیوں اور بہوؤں پر اُتارتی ہیں۔ یہ کرو۔ وہ نہ کرو۔ وہ کرو۔ یہ نہ کرو۔ اور اس طرح اندھی سماج کا چکر زندگی کی منزل پر سے گذر جاتا ہے۔ ہرجندر بڑے انہماک سے کھڑکی سے نیچے دیکھ رہا تھا کہ ایک شوخ لڑکی نے اس کی طرف دیکھ کر گایا۔

ہائے ہرجندر روے تیری ماسی

او نہوں لے گیا اک سنیاسی

ہائے وے اک سنیاسی

ہائے وے اک سنیاسی

دھب، دھب، دھب، دھب،

اور بہت سی لڑکیاں اس کی طرف دیکھ کر قہقہے لگانے لگیں اور ہرجندر شرما کر پیچھے ہٹ گیا۔ ایک بوڑھے بزرگ نے اُسے ڈانٹ پلائی، تم کھڑکی میں کیوں

کھڑے تھے؟ اگر گیت سُننے کا اتنا ہی شوق ہے تو ادھر چارپائی پر بیٹھ کر آرام سے سنو۔ یہ بھی کیا ڈھنگ ہے۔ اور پرکاش نے سوچا کہ یہ بھی کیا ڈھنگ ہے کہ ہمارے گاؤں کی ماسی کو یہی ایک سنیاسی لگا تھا۔ سنیاسی کیوں؟ ایک سنار یا چمار کیوں نہیں اور پھر اُسے خیال آیا کہ ہندوستانی سماج میں سنیاسی اور فقیر لوگ خاص عزت کے مالک ہیں۔ خدا کے یہ لاکھوں بندے کھانے پینے لوگوں سے بھیک مانگ کر ان کے ضمیر کو تسکین پہنچاتے ہیں۔ عمل اور جوتش سے اُن کے مستقبل کو روشن اور دلکش بناتے ہیں۔ کایا کلپ کرتے ہیں مکتی دلاتے ہیں اور اولاد سے محروم بیویوں کو بچے عطا کرتے ہیں۔ مبارک ہیں اُن کی زندگیاں، اور محبت سے لبریز ہیں اُن کی رُوحیں۔ اس لئے ماسی کا "سنیاسی" کے ساتھ بھاگ جانا چنداں تعجب خیز نہ تھا۔ ان فحش گیتوں میں اور عورتوں کی مسرور نگاہوں میں پرکاش کو اپنے تمدن کی ننگی روح جھلکتی ہوئی نظر آئی جس چیز کو ہر بڑے اور چھوٹے فرد نے گناہ کہہ کر دل کے نہاں خانے میں چھپا دیا تھا۔ آج وہی گناہ اُبل کر گانے والیوں کی آنکھوں میں جھلک رہا تھا۔ اور ڈھولک کی تال اور باریک آوازوں کی لرزتی ہوئی لَے میں ظاہر ہو رہا تھا، اور دوسری منزل پر یہ چیزیں ایسے ایسے بزرگ بھی سُن رہے تھے، جن کی طویل زندگی کا شاہکار یہ تھا کہ انہوں نے عمر بھر اپنی بیوی اور اپنی ماں کے علاوہ اور کسی عورت سے

ہنس کر بات بھی نہیں کی تھی۔ اسی لئے تو ایک معصوم شاعرہ ہلدی کی ایک گانٹھ کے عوض بیچ دی گئی تھی اور کھیتوں کی کھلی فضا میں پلی ہوئی سندر لڑیا، باسی پکوڑوں اور مٹھائیوں کی دکان پر ایک سرسراتے ہوئے میلے پردے کے پیچھے قید کر دی گئی تھی۔ زندگی غیر محدود تھی۔ عشق تازہ اور شباب زندہ تھا۔ لیکن تمدن بوڑھا اور عقل فرسودہ ہو چکی تھی اور سماج کے نیلام گھر میں اب بھی عورتوں کو کھلے بندوں بیچا جاتا تھا۔ البتہ قانوناً غلامی ممنوع تھی۔ پرکاش نے دل میں کہا کہ وہ ایسی باتیں سوچتا سوچتا پاگل ہو جائے گا۔ بہتر یہ ہے کہ وہ سو جانے کی کوشش کرے آنکھیں موند لے، اپنے پپوٹوں کو نیند سے بوجھل بنا لے اور سرہانے پر سر ٹیک کر سو جائے۔

اب گیت ہلکے ہو رہے تھے ..... دولھا بھائی سہرا باندھے ہوئے تشریف لے آئے تھے ..... پرکاش دتی اور دولھا ہون کنڈ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پنڈت مقدس منتر پڑھ رہے تھے۔ شعلے گھی کا مزہ چکھ کر بلند ہوتے جاتے تھے۔ ..... پنڈت زور زور سے منتر پڑھ رہا تھا..... پرکاش وتی اور دولھا خوشنما اور ٹیک بیدی کے ارد گرد گھوم رہے تھے۔ ایک....... دو..... تین..... چار ...... پانچ....... چھ...... سات......

منزل

جب پرکاش چند نے آنکھ کھولی تو ابھی اندھیرا تھا۔ اگرچہ مشرقی اُفق پر روشنی کی ایک دھندلی سی لکیر آ گئی تھی۔ لیکن آسمان پر ستارے ابھی تک بکھرے ہوئے تھے۔ نیچے آنگن کے فرش پر بیدی کے اردگرد بہت سی عورتیں سوئی ہوئی تھیں۔ ہون کنڈ میں آگ بجھ گئی تھی اور بیدی پر لٹکے ہوئے کیلے کے پتّے مرجھا گئے تھے۔ پرکاش نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کے اردگرد چارپائیوں پر گھر کے بہت سے لوگ سوئے ہوئے تھے۔ سوشیلا اور لیلا، ڈھولک بجاتے بجاتے تھک کر چُور ہو گئی تھیں۔ ببر کا چہرہ افسردہ تھا اور لب کھلے اور اس سے پرے پرکاش وتی ایک چُنری رنگی ساڑھی پہنے سو رہی تھی۔ اس کا ایک بازو چارپائی سے نیچے لٹک رہا تھا اور اُسی بازو میں ہاتھی دانت کا سیندوری چوڑا چڑھا ہُوا تھا۔ ماتھے پر سُرخ بندی۔ اُسے اُس کے لب مسکراتے ہوئے معلوم ہوئے۔ پرکاش نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ ہاں وہ اب تک مسکرا رہی تھی۔ نئی سہاگن جو لکڑی کی بیدی پر اپنا کنوارپن لٹا چکی تھی۔ اب بھی خواب میں مسکرا رہی تھی۔ پرکاش اس مسکراہٹ کی طنز کی تاب نہ لا سکا۔

وہ آہستہ سے بستر پر سے اٹھ بیٹھا۔ وہ کسی کو جگانا نہ چاہتا تھا۔ وہ ہولے ہولے سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔ آنگن کے فرش پر وہ نہایت احتیاط سے گذرا۔ اس کے چاروں طرف لڑکے، لڑکیوں اور عورتوں کے جسم پڑے تھے۔ کسی کے بازو ننگے، کسی کی چھاتیاں، کسی کے بالوں کی لٹیں کھلے ہوئے ہونٹوں کے کناروں پر کسی کی ٹانگیں سکڑی ہوئی، کسی کی پھیلی ہوئی۔ کسی کی سانس میں خراٹے تھے ...... کسی کی آنکھیں نیم وا...... ان کے درمیان میں بیدی تھی۔ لیکن سنہری تار ادھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ کیلے کے پتے مرجھا گئے تھے اور ہون کنڈ کی آگ بجھ گئی تھی۔ شعلوں نے قربانی لے لی تھی اور اب خاموش تھے۔ زندہ انسان کھانے والوں نے ایک زندہ روح کو نگل لیا تھا اور اب مدہوش تھے۔ پرکاش نے آہستہ سے دروازے کے کواڑ کھولے اور باہر چلا گیا۔

وہ قصبے سے باہر کھیتوں کی طرف نکل گیا، آسمان پر ستارے بکھرے ہوئے تھے اور فرش زمین پر شبنم کے لاکھوں قطرے بیدار ہو رہے تھے۔ گم ہوتے ہوئے اندھیرے کی خنکی میں ایک عجیب سی تازگی تھی اور جاگتی ہوئی سحر کے نور میں ایک نیا حسن۔ کیکر اور شیشم کے تنوں پر نہ دکھائی دینے والے بیٹے ابھی تک پیں پیں کئے جاتے تھے اور کوئی نامعلوم پرندہ کوہو، کوہو رٹ رہا تھا۔ بیر کی جھاڑیوں پر گھاس

کے ٹنڈے ابھی تک سوئے پڑے تھے اور پتوں کے درمیان گول گول بیروں سے شبنم کے موتی اس طرح لگے ہوئے تھے گویا مدورا کے مندر ٹنکے ہوئے ہوں۔ زمین جیسے لمبے لمبے سانس لیکر بیدار ہورہی تھی۔ کھیتوں کے کناروں پر اُگی ہوئی گھاس میں ہزاروں نیلے نیلے پھول اپنی آنکھیں کھولنے لگے، پھر دور کہیں اُس نے رہٹ کے چلنے کی رُوں رُوں سُنی اور پورب میں حدِ افق پر روشنی کی لکیر بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔

وہ کھیتوں میں دوڑتا ہوا چلا گیا، اس کے پائجامے کے پائنچے اور پاؤں میں پہنے ہوئے چپل شبنم میں دھوئے گئے۔ لیکن وہ دوڑتا ہی گیا۔ تاریکی کم ہوتی گئی۔ اور اس نے اپنے نتھنوں میں وہ عجیب سی خوشبو محسوس کی جس سے مشرق کی ہوا بوجھل تھی۔ آج اس نے پہلی مرتبہ صبح کو جاگتے دیکھا تھا۔ ورنہ شہر میں رہتے ہوئے تو اُس کی آنکھ اُس وقت کھلتی تھی جب دھوپ کا پیلا پن تو کھڑکی کے شیشے سے نکل کر اس کے چہرے پر آجاتا تھا۔ لیکن آج وہ ایک غیر مرئی ہستی سے تعارف حاصل کر رہا تھا اور جب پورب کی ہوا اُس کے چہرے پر سے گزرنے لگی تو اُس نے اپنی آنکھوں اور اپنے رخساروں پر صبح کی رانی کی نازک اُنگلیوں کے لمس کو محسوس کیا، اُس کے عطر بیز بالوں کی خوشبو کو سونگھا اور اپنے ہونٹوں پر اس کے شبنمی لبوں کی حلاوت کا مزہ چکھا اور وہ خوشی سے بھرپور دوڑتا چلا گیا۔

زمین اُسے اپنے پاس بلا رہی تھی۔ میلوں تک پھیلے ہوئے کھیتوں پر مٹی کی کی سوندھی، لطیف اور پاکیزہ خوشبو ایک ہلکے کہرے کی طرح چھائی ہوئی تھی آہستہ آہستہ درختوں کے تنوں پر ٹلے اور گلہریوں کی دُمیں سرکنے لگیں اور کھیت کے کناروں کی اوٹ میں چھپتے ہوئے خرگوش بھاگنے لگے، دور ایک اُونچی بینڈھ پہ ایک مورنی کھڑی تھی اور مور اپنے دلکش پروں کے چھتر کو پھیلائے اس کے سامنے ناچ رہا تھا۔ ساری کائنات نغمہ ریز تھی اور زمین اپنے محور پہ گھومتی ہوئی ناچ رہی تھی! اس دلکش، دلفریب اور ابدی رقص کے سامنے انسانی زندگیاں اُس کی مسرتیں اور غم کس قدر ہیچ تھے۔ ان کا منبع نامعلوم اور انکی منزل ناپید..... مور کے چھتر پہ مختلف رنگوں کی نازک جھلکیاں بدلتی جاتی تھیں۔ ارغوانی..... آسمانی ......دھانی، خوشیاں......غم......زندگیاں......پرکاش نے سوچا یہ زمین ناچتی جائیگی، یہاں تک کہ انسانی زندگی، اُس کی تہذیب، تمدّن، اس کے دعاوی باطل راکھ کا ڈھیر ہو جائیں گے۔ زمین چاند کی طرح خاموش اور مغرور ہو جائیگی۔ لیکن پھر بھی یہ زمین ناچتی جائے گی...... ہم کس قدر حقیر ہیں۔ پرکاش نے سوچا، بیر کی ٹہنیوں پر سوئے ہوئے ٹڈوں کی طرح...... یکایک کیکر کے ایک درخت کی چوٹی پر بیٹھا ہوا کوا چیخ اُٹھا اور ساری کائنات میں اُجالا ہی اُجالا ہو گیا۔ زمین کا رقص رُک گیا۔

بینے کی پئیں پئیں بند ہو گئی۔ مور اور مورنی مغرب میں آموں کے جھنڈ کی طرف پرواز کر گئے اور پرکاش کھیتوں میں ڈھنڈا ڈھنڈا تا رک گیا اور کہنے لگا۔ ہائے وہ صبح کی رانی کہاں گئی؟...... وہ رانی جو گم ہوتے ہوئے اندھیرے کے نازک سایوں میں شبنم کے موتی چمکاتی ہوئی آئی تھی اور بڑھتے ہوئے نور سے شرما کر پھر اُسی تاریکی میں گم ہو گئی......
ہائے وہ صبح کی رانی! وہ بہت دیر تک ایک رہٹ پر نہاتا رہا۔ اس کی روح ہلکی ہو گئی تھی اور دل و دماغ ہر قسم کے خیالات سے گریزاں۔ آم کے درختوں پر چھوٹی چھوٹی سبز کیریاں لٹک رہی تھیں اور ہرے بھرے طوطے ٹیں ٹیں کر رہے تھے۔ بیلوں کے پیچھے بیٹھا ہوا کسان ایک کھلونا معلوم ہو رہا تھا اور بیل رہٹ کے محور کے گرد گھومتے جاتے تھے...... رُوں...... رُوں...... رُوں اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے جسم کے ہر ذرّے سے آواز نکل رہی ہے...... رُوں...... رُوں...... رُوں...... اس بے مطلب اور بے معنی صدائیں اُسے ایک نامعلوم سی مسرت محسوس ہونے لگی اور وہ آنکھیں بند کر کے نہاتا گیا اور اُسے سنتا گیا...... رُوں...... رُوں...... رُوں...... بے مطلب بے معنی...... منبع نامعلوم...... منزل ناپید...... اب وہ آنکھیں بند کئے ہوئے بھی بیلوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے اُس کسان کو دیکھ رہا تھا جو کھلونے کی طرح معلوم ہو رہا تھا اور بیل جو رہٹ کے محور کے گرد گھومتے جاتے تھے...رُوں..... رُوں.... رُوں ......

گرہن کی ایک شام

عرشی اور ارضی کی بحث بہت پرانی ہے۔ وہ ادیب جو ہر وقت آسمان پر نظر رکھتے ہیں۔ ان کی خدمت میں میں صرف یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ ہماری زمین بھی ایک ستارہ ہے۔

(میکسم گورکی)

مدتوں سے تمہیں خط نہیں لکھ سکا۔ شاید اوشا کی فریب کاریوں کو بھولنے کی کوشش کر رہا تھا یا پھر جگدیش کی دلدوز محبت کا آخری منظر دیکھنے میں مصروف تھا۔ کچھ ٹھیک طرح سے تمہیں نہیں بتا سکتا۔ ممکن ہے کہ تم پوچھو۔ کیا جگدیش بھی محبت کر سکتا ہے۔ موٹا سا آدمی۔ گو کچھ اتنا موٹا بھی نہیں۔ لب پر ہر وقت مسکراہٹ شکار کا شوقین۔ برج اور بیر کا پجاری۔ کیا ایسا شخص بھی الفت کی ستمگاریوں کی

تاب لاسکتا ہے، تو میری جان، میرے پاس اس کا جواب یہ ہے کہ..... مگر نہیں یہ بہتر ہوگا کہ پہلے میں تمہیں اُس جگہ کے متعلق بتاؤں جہاں ہم گذشتہ ڈیڑھ ماہ سے پڑے ہوئے ہیں۔ کیونکہ ماحول نہ صرف حیاتِ معاشقہ کا بلکہ ہماری تمام زندگی کا جزوِ اعظم ہے اور خاص کر محبّت اور ماحول میں جو گہرا تعلق ہے۔ وہ مجنوں کی بادہ پیمائی اور فرہاد کی کوہ کنی سے صاف عیاں ہے۔ دور کیوں جاؤ۔ تمہارے وطن پنجاب ہی میں سوہنی مہنیوال کا افسانہ محبّت دریائے چناب کی پر شور ردانیوں کا رہینِ منّت ہے اور ہیر رانجھے کا دلفریب قصّہ اُلفت ذات پات اور قبائلی رکاوٹوں کی دیوار پر عشق پیچاں کی طرح آویزاں نظر آتا ہے اور سچ پوچھو تو غالباً ہم کسی فردِ واحد سے محبّت نہیں کرتے بلکہ اگر محبت کرتے ہیں تو صرف اپنے آپ سے در اصل انسانی محبّت بذاتِ خود ایک حقیر سی شے ہے، محبّت ہے کیا؟ یہی دو دھڑکتے ہوئے دلوں کا سنگم، لیکن جو چیز اسے عرفانی بلندیوں پر لے جاتی ہے یا اہر منی پستیوں میں گرا دیتی ہے۔ وہ اس کا ماحول ہی ہے۔ ماحول کی اہمیت سے زندگی کی عظمت سے انکار کرنا ہے۔ بچارا جگدیش بھی ایسا ہی کیا کرتا تھا۔ لیکن آج اُس کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں سے پوچھو جن کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے ہیں اور جن کی گہرائیوں کا الم کسی بے کس زخمی، سسکتے ہوئے آہو کے درد کا آئینہ دار ہے۔

سب سے پہلی بات جو میں تمہیں اس جگہ کی بابت بتانا چاہتا ہوں۔ وہ اس
کی بلندی ہے۔ یہ جگہ سطح سمندر سے سترہ ہزار فٹ بلند ہے۔ اس رفعت پر پہنچکر
انسانی محبت بھی بلند ہو جاتی ہے۔ خیالات و تأثرات میں غیر ارادی و غیر شعوری طور
پر ایک انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ دماغ پر ایک عجیب سا وجد طاری ہو جاتا ہے
تنفس کا دور تیز ہو جاتا ہے اور کاندھوں پر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منوں بوجھ تھا۔
جو اُٹھ گیا۔ اُوپر دیکھو تو اُڑنے کو جی چاہتا ہے اور نیچے دیکھو تو دور میلوں تک
سلسلہ ہائے کوہ گرتے اُبھرتے اور پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چشم زدن میں نظر
ان پہاڑوں اور وادیوں سے پھسلتی ہوئی نچلے میدانوں پر پڑتی ہے اور نظر کا آخری
نقطہ وہ ہے جہاں دریائے جہلم کا پانی چاندی کے پتلے تار کی طرح چمکتا ہوا نظر
آتا ہے۔ اس بلندی پر پہنچکر آدمی نسبتیوں کو بھول جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو
اتنا ہی پاک و صاف سمجھتا ہے جتنی کہ یہ سپید برف جس کی آب و تاب میں موت
کی خاموشی اور قدرت کی پاکیزگی پنہاں ہے۔ یہاں آکر مجھے احساس ہوا کہ اوشا
کی محبت کتنی حقیر تھی اور اس کا دائرہ کتنا محدود! یہ وہ محبت تھی جو صرف
ڈرائنگ روم ہی میں کی جا سکتی ہے۔ اس استوائی پھول کی طرح جو شیشے کی دیوار
کے اندر ایک محبوس باغیچے ہی میں کھل سکتا ہے۔ اور مصنوعی روشنی، مصنوعی حرارت

اور مصنوعی غذائیت کا محتاج ہے، ڈرائنگ روم ریشمیں ساریاں، برقی قمقمے مصنوعی چلتے ہوئے فقرے۔ میں حیران ہوں کیا واقعی مجھے اوشا سے محبت تھی یا شاید یہ اُس غیر فطری ماحول کا اثر تھا، جو باہر کی کھلی اور خوشگوار فضا میں پہنچ کر مٹ گیا۔

یہاں بجلیاں کوندتی ہیں، بادل گرجتے ہیں، رم جھم، رم جھم بارش ہوتی ہے اولے پڑتے ہیں، برف گرتی ہے۔ پھر ہوا کے چند تیز و تند جھونکے آتے ہیں۔ اور مطلع صاف ہوجاتا ہے، آسمان خوشنما نیلگوں، آفتاب سونے کے تھال کی طرح درخشاں، اور پر پھیلائے ہوئے ہوا میں تیرتی ہوئی چیل کسی پری کی طرح حسین نظر آتی ہے۔ ہم اپنے خیمے کا جالی دار پردہ کھولتے ہیں۔ گرم کافی کی پیالی ہاتھ میں۔ بندوق کاندھے پر لٹکائے باہر نظر دوڑاتے ہیں۔ چاروں طرف برف ہے، ہوا خاموش ہے۔ آسمان صاف ہے۔ ہم آہستہ آہستہ کافی پیتے اور چمڑے کے جوتوں کے اُوپر دھان کے خوشوں سے بنے ہوئے جوتے پہن لیتے ہیں اور شکار کی تلاش میں چل پڑتے ہیں۔ یہاں شکار بہت ملتا ہے، جنگلی بکریاں۔ رونسے۔ ریچھ اور بھیڑیے، آخر الذکر بھولے بھٹکے شکاریوں کو ہی شکار کر لیتے ہیں۔ پھر رات کے وقت الاؤ کے قریب خیمہ میں بچارا چوکیدار اُس کا جانباز کتا آگ تاپتے ہوئے

مایوسانہ نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ کالی رات میں ہوا سیٹیاں بجاتی ہے۔ بھیڑیے چلاتے ہیں۔ پھر برف کے تودوں کے گرنے سے ایک مہیب اور خوفناک آواز پیدا ہوتی ہے جو دور دور تک پھیلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، اس کے بعد خاموشی، مکمل خاموشی، موت اور سکون، شکاری نہیں آیا۔ شکاری اب کبھی نہیں آئے گا۔ شکار کرتے کرتے وہ خود شکار ہو گیا، اس کی ہڈیاں برف کے تودوں کے نیچے ہیں اور اُن پر بھیڑیئے ناچ رہے ہیں۔

لیکن گھبراؤ نہیں دوست۔ ہم ابھی تک زندہ ہیں۔ صحیح وسلامت اور اب تک ایک درجن کے قریب ریچھوں، رونسوں، اور بھیڑیوں کو گولی کا نشانہ بنا چکے ہیں۔

جس جگہ ہمارا کیمپ ہے، اس سے کوئی ڈیڑھ پونے دو میل نیچے مغرب کی طرف گرجن کا دلکش مقام ہے، اس سے زیادہ دلکش جگہ میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھی۔ یہاں سے پورے دو میل بھی نہ ہوگا، لیکن اُف! کتنا دشوار گذار راستہ ہے اور پھر کئی جگہ اس قدر پھسلن ہے کہ ذرا پاؤں ادھر اُدھر ہوا توازن برقرار نہ رہا تو آدمی چشم زدن میں سینکڑوں فٹ نیچے برف سے اٹی ہوئی کسی کھڈ میں جا گرتا ہے۔ اب تو ہم اس راستے سے کسی قدر واقف ہو گئے ہیں۔ لیکن پھر بھی متواتر برف و باراں سے ہر روز نیا راستہ تراشنا پڑتا ہے،

گرجن کی ایک شام

اور پھر بھی دلجمعی سے چلتے چلتے، دائیں یا بائیں نیچے نظر پڑ جائے تو ان بے پناہ گہرائیوں کو دیکھ کر بے اختیار سارے جسم میں اک پھریری سی آجاتی ہے۔

گرجن کا مقام گرمیوں میں رہنے کے لئے بہترین جگہ ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ وہ ہزاروں سیاح جو ہر سال گلمرگ جاتے ہیں، انہیں یہ معلوم نہیں کہ گرجن گلمرگ سے کس قدر نزدیک ہے۔ گرجن میں کہیں کہیں برف کے ٹیلے ہیں تو کہیں ایسے ہموار تلے جن پہ گرمیوں میں ریشم کی طرح نرم اور ملائم گھاس اگتی ہے۔ کہیں کہیں پہاڑ کی شکنوں میں تُنگ کے تناور درخت کھڑے ہیں۔ جو برف و باراں میں محفوظ خیموں کا کام دیتے ہیں، یہاں پانچ جھیلیں ہیں چھوٹی چھوٹی اور خوش نما، سب سے بڑی جھیل کو نندن سر کہتے ہیں۔ یہ کوئی ڈھائی تین میل لمبی چوڑی ہو گی۔ سال میں دس مہینے یخ بستہ رہتی ہے۔ لیکن جب ہم نے اُسے دیکھا تو گہرے نیلے رنگ کا ایک تختہ آب بن رہی تھی، اور چاروں طرف پیلے پیلے جنگلی پھولوں سے مرصع تھی۔ یہ غالباً دنیا کی سب سے اُونچی جھیلوں میں سے ہوں گی اور اس زمانے کی یاد دلاتی ہیں۔ جب تمام دنیا زیر سطح آب تھی۔ پھر جب آہستہ آہستہ ہمالیہ کے پہاڑ نمودار ہوئے تو یہ جھیلیں وہیں پانی کے گڑھوں کی مانند رہ گئیں۔

ننداآن سر پر غروب آفتاب کا جو نظارہ ہوتا ہے۔ وہ نہ جھیل ڈل پر میسر ہے
نہ وولر پر، یہاں نہ ہوٹل ہیں۔ نہ شکارے۔ نہ سیاح۔ نہ موٹریں، نہایت دشوار گذار
راستے ہیں جو سال میں صرف تین چار ماہ کھلے رہتے ہیں اور جن پر جفاکش اور
خانہ بدوش گڈریے، اپنے ریوڑوں کو گرجن کے مرغزاروں میں چرانے کے لئے لاتے
ہیں۔ اور اگست کے پہلے ہفتے ہی میں پھر نیچے کی آبادیوں میں چلے جاتے ہیں۔
شاذ ہی کوئی سیاح یہاں آنکلتا ہے، شکار کا شوقین یا تنہائی کا دلدادہ، اور
پھر اُسے شاذ ہی واپس جانا نصیب ہوتا ہے۔ پھر یہیں کہیں برف کے تودوں میں
یا بھیڑیوں کے پیٹ میں، یا ان تناور زنگوں کے قریب اُس کی قبر بنتی ہے۔ اس لحاظ
سے گرجن بہت بدنام ہے اور گڈریے تو گرجن دیوتا کو پوجتے ہیں جو اس پہاڑ کی
چوٹی پر رہتا ہے جہاں ہمارا کیمپ ہے۔ گرجن کے دیوتا کو آج تک کسی نے
نہیں دیکھا۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ گرجن کے دیوتا کو پردیسیوں، مسافروں اور سیاحوں
سے بہت نفرت ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ ماسوا، اُن پہاڑی گڈریوں کے جو اُسے
پوجتے ہیں، اور کسی کا بھی اُس کے علاقے میں گزر ہو۔ گڈریے جانتے ہیں کہ گرجن
دیوتا جس پر ناراض ہوتا ہے۔ اُسے موت کی سزا دیتا ہے، اور جس پر خوش ہوتا ہے
اُس کی بکریوں میں دودھ زیادہ کر دیتا ہے، اس کی بھیڑوں کو نہایت خوبصورت

ملائم ریشم سے ڈھک دیتا ہے۔ برف میں، جھکڑ میں، طوفان میں، ہر حالت میں اُس کے ریوڑ کی حفاظت کرتا ہے۔

گرجن کی ایک دلفریب شام کا ذکر ہے، میں جگدیش اور ریوا (ایک پہاڑی شکاری جسے ہم ترائی کے علاقے سے اپنے ساتھ لائے تھے) شکار کھیل کر واپس کیمپ کی طرف جارہے تھے۔ اور راستے میں نندن سر کے مقام پر بیٹھ کر سستانے لگے تھے۔ اُس وقت سورج غروب ہونے کو تھا۔ ہوا میں ایسی خنکی تھی کہ ہر سانس میں برف کے لطیف۔۔۔ گالے منہ کے اندر جاتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ گرجن کی چوٹی پر اُجلے اُجلے بادل منڈلا رہے تھے۔ بادلوں اور ڈوبتے ہوئے سورج کے عکس سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی عالیشان محل کے نیلگوں فرش پہ ایک طلائی ستون کھڑا ہے اور ایک مرمریں محراب کو سہارا دے رہا ہے۔ معاً جگدیش نے پانی کی سطح پر ایک سنگریزہ پھینکا ارتعاش پیدا ہوا۔ اور دوسرے لمحے میں وہ خوبصورت محل اور طلائی ستون تھرتھرا کر لاکھوں جواہر ریزوں میں بکھر گیا اب پانی کی سطح پر لاکھوں سورج تلاطم تھے جگدیش نے ہاتھ بڑھا کر اپنے قریب کے پیلے پیلے پھولوں کو توڑ کر ایک گچھا بنایا اور انہیں اپنے کوٹ پر ٹانکتے ہوئے بولا۔ کتنے خوبصورت پھول ہیں۔ ان کی مہک، ان کا رنگ، یہ مست کر دینے والا کیف آور تعطر۔ ریوا۔ ان خوبصورت

پھولوں کا کیا نام ہے؟"

ریوا کسمسایا، وہ رونسوں کی قسمیں پہچانتا تھا۔ ریچھوں کو دو میل کی دوری سے سونگھ لیتا تھا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں عقاب کی سی تیزی تھی۔ جو سَن کی طرح سامنے سے اڑنے والے سہنولے پر شست لگانے میں بھی کبھی غلطی نہ کرتی تھیں لیکن وہ ان پھولوں کے نام نہ جانتا تھا۔ اچھا شکاری کبھی اچھا شاعر نہیں ہوتا۔ اُس کے بھُورے رخسار اور بھی بھُورے ہو گئے اور وہ رُک رُک کر بولا۔ "مجھے ——پتہ —— نہیں۔"

جگدیش کو ریوا کی بے چینی میں بہت لطف آیا۔ پھر وہ آہستہ سے بولا۔ "ٹھیک ہے۔ ان پھولوں کے نام سے کسی کو آگاہ نہ ہونا چاہیئے۔ شاید ان پھُولوں کا کوئی نام ہی نہیں اور یوں بھی خوبصُورتی کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ حُسن کی کوئی ذات نہیں"

میں نے مسکرا کر احتجاجاً کہا۔ "جملہ حقوق محفوظ، تم میری باتیں دہرا رہے ہو۔"

ریوا بے چینی سے اپنی جگہ پر ہلا۔

جگدیش نے مزاحاً کہا۔ "ہونہہ۔ جملہ حقوق محفوظ! شاید تم یہ سمجھ رہے ہو کہ تم اوشا کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہمارے بھلے مانس، یہ گرجن ہے گرجن۔"

جگدیش نے بہ مشکل یہ فقرہ زبان سے ادا کیا ہو گا کہ بادل زور سے گرجا۔

یہاں موسم کتنا غیر معین ہے۔ پل میں دھوپ، پل میں برف و باراں، ریوا نے ایک نظر بھر کر اُن بادلوں کی طرف دیکھا جو اب گر جن کی چوٹی کے گرد اکٹھے ہو رہے تھے۔ اُس نے نتھنے پھیلا کر شمالی ہوا کو سونگھا، اور پھر اپنے فرغل کے بٹن بند کرتے ہوئے بولا "جلدی چلو۔ طوفان آرہا ہے۔"

ہم نے اپنی سمور کی ٹوپیاں پھولوں کے تختوں سے ڈھونڈھ نکالیں اور انہیں پہن کر چل کھڑے ہوئے۔ اگرچہ ابھی دھوپ چمک رہی تھی۔ لیکن کئی جگہوں پر پہاڑوں اور گھاٹیوں کے مختلف حصّوں پر سفید بادل اپنا سایہ ڈال رہے تھے۔ ہوا کی خنکی ہر لحظہ بڑھتی جارہی تھی۔ اور ہمیں تو ابھی بہت اُوپر اپنے کیمپ تک پہنچنا تھا۔ ہم جلد جلد لیکن نہایت خاموشی سے راستے پر چڑھتے جانے لگے۔ گر جن کی چوٹی پر سے بادل نیچے کی طرف پھیل رہے تھے۔ ایک ہلکا سا جھکڑ چلنے لگا تھا اور کہیں کہیں روئیں جیسی پتلی اور ہلکی دھند ہمارے راستے میں آجاتی تھی۔ ہم نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی، لیکن کوئی پون گھنٹہ کے سفر کے بعد طوفان نے ہمیں آ ہی لیا۔ ہلکی ہلکی بارش، اور پھر کرنڈی اور اُس کے ساتھ فوراً ہی برف گرنی شروع ہوئی ریوا سب سے آگے تھا۔ درمیان میں جگدیش، اور آخر میں، میں ہم تینوں کی کمر میں ایک ہی رسی بندھی ہوئی تھی۔ ریوا ہمارا رہنما تھا۔ پندرہ بیس منٹ اور چلے۔ یکایک

میری کمر کو ایک سخت جھٹکا لگا۔ بہت سخت، اتنا کہ اگر میرے حواس بجا نہ ہوتے اور برچھا میرے پاس نہ ہوتا تو میں یقیناً اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکتا، اب میں برچھے کے سہارے کھڑا زور لگا رہا تھا۔ کیونکہ رسّا بائیں طرف جھکا ہوا تھا۔

چاروں طرف دھند چھا گئی تھی۔

اُوپر سے ربوا کی آواز آئی "سنبھل جاؤ۔ سنبھل جاؤ۔"

"کیا ہوا؟" میں نے چلّا کر پوچھا۔

جگدیش کی آواز آئی "میں برف پر گر گیا ہوں۔ اُف کتنا درد ہے۔ اُٹھا نہیں جاتا۔ پاؤں میں ضرب آ گئی ہے۔"

"اُٹھو، اُٹھو، کوشش کرو" میں نے رسّی پر زور لگاتے ہوئے کہا۔

طوفان نے ہمیں گھیر لیا تھا۔ دھند سفید تھی۔ لیکن تاریکی سے بھی بدتر، میرے اور ربوا کے درمیان جگدیش کہیں بیچ میں برف پر گرا ہوا تھا اور ہم اسے اُٹھا نہ سکتے تھے۔

ربوا کی آواز آئی "توازن ٹھیک رکھو۔ رسّی کو دائیں طرف جھٹکا دو۔ ایک ...... دو ...... تین"

بڑا زور لگایا۔ لیکن جگدیش اُٹھ نہ سکا۔

آخر رسّی کو بل دیتے ہوئے اور برچھے سے کچّی گرہیں باندھتے ہوئے میں ریوا اور جگدیش تینوں ایک مقام پہ جمع ہو گئے۔ میں نیچے سے چل کر اوپر جگدیش کے پاس پہنچ گیا اور اسی طرح ریوا اُوپر سے نیچے کو آتا ہوا جگدیش کے پاس آگیا۔ جگدیش گھٹنوں کے بل پڑا ہوا کراہ رہا تھا۔

"کیا ہوا جگدیش؟" میں نے جھک کر جگدیش کو اُٹھاتے ہوئے پوچھا۔

جگدیش سہارا لیکر اُٹھ کھڑا ہوا، مگر پھر فوراً برف پر بیٹھ گیا۔ "آہ مجھ سے تو اب چلا بھی نہ جائیگا۔ پاؤں میں ضرب آئی ہے۔"

چاروں طرف سفید دھند چھا گئی تھی۔ ہوا میں ایک وحشیانہ تیزی تھی۔ برف خاموشی سے گر رہی تھی۔

"ہُو...... ہُوآ...... آآآ ہُو...... ہُوا...... آآآ...... ہُو" ریوا نے دو بار سیٹی بجائی۔ سیٹی کی تیز آواز کسی نوکدار خنجر کی دھار کی طرح تلملاتی ہوئی، طوفان کو چیرتی ہوئی گذر گئی۔ اور پھر چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔

"ہُوآ...... آ...... آہُو، ہُوآ...... آ...... آ...... آ...... ہُو" ریوا نے چند لمحوں کے بعد پھر سیٹی بجائی۔ کہیں سے کوئی جواب نہ آیا۔

ریوا نے ایک متعین وقفے کے بعد پھر سیٹی بجائی، اور ہم تینوں دھڑکتے

ہوئے دلوں سے اُسکے جواب کے منتظر رہے لیکن کانوں میں صرف بڑھتے ہوئے طوفان کے وحشیانہ قہقہے تھے سردی دم بدم بڑھ رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں سُن ہو رہے تھے۔ آنکھوں میں نیند آ رہی تھی۔

"مت سوؤ۔ جگدیش مت سوؤ" ریوا نے سیٹیوں کے درمیانی وقفے میں کہا۔ میری آنکھوں میں ایک عجیب سا خمار چھا رہا تھا۔ پپوٹے بند ہوئے جاتے تھے، جانتا تھا کہ مجھے سونا نہ چاہیئے۔ جانتا تھا کہ یہ خمار موت کا خمار ہے، یہ نیند اجل کی نیند ہے۔ آخری اور کبھی نہ ختم ہونے والی نیند۔ پھر بھی آنکھیں جھپک جھپک جاتی تھیں اور جگدیش بچارا تو بالکل اُونگھ رہا تھا۔

ریوا نے ہم دونوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "میری بات سنو، میری بات سنو، دیکھو۔ دیکھو۔ میری طرف دیکھو، اپنی مٹھیوں میں برف بھینچ لو۔ زور سے، زور لگاؤ اور زور لگاؤ، اور......"

ہُوا آ آ آ..... ہو..... ہو آ آ آ...... ہُو" دور نیچے سے کسی مدھم سیٹی کی آواز سنائی دی۔ ریوا نے جواب میں سیٹی بجائی۔ سیٹی کی آواز، ایسا معلوم ہوا کہ دور دور پھیلتی جا رہی ہے اور خطرے کا سگنل دے رہی ہے۔ امداد کے لئے پکار رہی ہے۔ اس سیٹی میں کتنا خوف تھا۔ کتنی التجا۔ کتنا درد، کتنی اُمید، ہمارے

کان اُس کے جواب کی طرف لگ گئے۔ کیا سچ مچ سیٹی کا جواب آیا تھا۔ کیا یہ محض ایک واہمہ تو نہ تھا۔

مگر نہیں دور نیچے۔ کہیں سے پھر سیٹی کی آواز سنائی دی۔ مدھم میٹھی۔ امید دلانے والی، اس برفانی طوفان میں وہ سیٹی روشنی کے مینار کی طرح چمک اُٹھی۔

قدرے توقف کے بعد ریڈا نے پھر سیٹی بجائی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد اس کا جواب آیا۔ ایک سیٹی کہہ رہی تھی "ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ طوفان میں گھرے ہوئے ہیں۔" دوسری کہہ رہی تھی "گھبراؤ نہیں۔ ہم آرہے ہیں۔" دوسری سیٹی نزدیک آتے آتے پھر دور ہو جاتی۔ شاید راستے سے پرے ہٹنا پڑا ہوگا۔ اس طرح ایک گھنٹہ گزر گیا۔ آدھ گھنٹہ اور، اب آنے والا ہمارے نزدیک ہی کہیں تھا۔ چند منٹ اور اضطراب میں گزرے۔ اب ہمارے سامنے ایک جفاکش ادھیڑ عمر کا پہاڑی کھڑا تھا۔ اُس کی چھاتی پر ایک لالٹین بندھی تھی۔ جس کی مدھم روشنی اس تاریک دھند کو چیر کر بمشکل ایک دو گز دور جاتی تھی۔ اُس کے ساتھ ہی ایک چھریرے بدن کا جوان کھڑا تھا۔ لیکن دھند میں اُن کی صورتیں اچھی طرح پہچانی نہ جاتی تھیں۔ بس سائے سے معلوم ہوتے تھے۔

جفاکش پہاڑی نے پوچھا "کیا بات ہے، طوفان میں کیسے گھر گئے؟"

ریوا نے جواب دیا۔" ہمارے ساتھی کو چوٹ آگئی اور ـــــ" اُس نے فقرہ نامکمل رہنے دیا۔

جفاکش پہاڑی چند منٹ تک چپ رہا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

چند منٹ آرام کے بعد پہاڑی نے چھریرے بدن کے جوان جگدیش کی طرف اشارہ کر کے کہا۔" اسے اٹھالو۔" میں مشکل راستے کی رہنمائی کر سکوں گا۔"

چھریرے سائے نے چند لمحوں کے لئے توقف کیا، پھر وہ جھکا اور اپنے مضبوط ہاتھوں سے جگدیش کو اٹھا کر اپنی پشت پر گردن کے قریب رکھ لیا، دوسرے پہاڑی نے ایک رسّی سے جگدیش کی ٹانگیں اُس کی کمر سے باندھ دیں۔ پھر ایک رسّا اپنی کمر سے باندھ کر اُس جوان کی کمر کے گرد لپیٹا۔ پھر وہ رسّا مجھ تک پہنچا، میں نے اُسے کمر میں باندھ کر ریوا کے حوالے کیا، آخر میں ریوا نے اُسے مضبوطی سے اپنی کمر میں باندھ لیا۔

"تیار ہو۔" پہاڑی نے ہمیں چوکنا کرتے ہوئے کہا۔" برچھے مضبوطی سے تھامو۔ ایک .... دو ... تین" اور اس طرح رات کی تاریکی میں، برف کے خطرناک سمندر میں یہ کارواں از سرِ نو گرجن کو چلا۔

پہاڑی کا گھر ایک تنگ کے نیچے تھا، وہاں پہنچکر اس نے جلدی سے دو نمین کھالیں نکال کر زمین پر بچھائیں اور دوسرے پہاڑی نے جگدیش کو وہاں لٹا دیا۔ جگدیش بے ہوش تھا یا شاید برف کی نیند سو رہا تھا۔ ادھیڑ عمر کا پہاڑی تنبے کی کوکھ کے اندر گیا اور وہاں سے اپنی مٹھی میں ایک گول مڑی ہوئی چمڑے کی تھیلی سی باہر لایا۔ الاؤ کی سُرخ روشنی میں میں نے دیکھا۔ یہ ایک نافہ تھا۔

"ذی شی لالٹین بجھا دو" پہاڑی نے اپنے ساتھی سے کہا۔ جواب ایک طرف اندھیرے میں بیٹھا ہوا سستا رہا تھا۔ اندھیرے میں ایک لمبے سانس کی آواز سنائی دی اور پہاڑی کا ساتھی الاؤ کی طرف بڑھا۔ اُسے تاریکی سے روشنی میں آتے ہوئے میں نے دیکھا کہ وہ ایک جوان لڑکی تھی۔ اب اُس نے اپنی سمور کی ٹوپی اُتار پھینکی تھی۔ جس نے اُس کے لمبے بالوں کو چھپا رکھا تھا، اُس کی آنکھیں تکان سے نیم وا تھیں اور جبین پسینے سے تر تھی۔ اپنے مضبوط ہاتھوں سے اُس نے پہاڑی کی کمر سے لالٹین کو کھولا۔ اور ایک پھونک مار کر اُسے بجھا دیا۔ پھر لالٹین ہاتھ میں لیکر سر کو ایک طرف جھکائے ہوئے وہ واپس اندھیرے میں چلی گئی۔

پہاڑی گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ اور جگدیش کے تنفس پر غور کرنے لگا۔ کچھ عرصے کے بعد اُس نے لکڑی کے بڑے چمچے میں تھوڑا سا گرم دودھ اور نافہ

ڈال کر ہلایا اور اُسے جگدیش کے منہ میں اُنڈیل دیا۔ ایک اور چمچے میں اُس نے کوئی اور چیز گرم کی جو غالباً کسی جانور کی چربی معلوم ہوتی تھی۔ اور بہت بدبودار تھی۔ جب وہ چربی بھی گرم ہو کر سیال بن گئی تو اُس میں بھی اس نے تھوڑا اسا نافہ ڈال دیا اور اُسے اُنگلی سے ہلاتے ہوئے اُس نے ذی شی کو پکارا۔

"کیوں۔ کیا بات ہے؟" ذی شی نے وہیں اندھیرے میں بیٹھے ہوئے جواب دیا۔ اُس کی آواز سست اور مضمحل تھی۔

"ادھر آنا بٹیا۔ ذرا ان کی کنپٹیوں کو سہلاؤ۔ یہ لو روغن۔"

ذی شی نے جگدیش کا کن ٹوپ اُتار لیا۔ اور اُس کا سر اپنی گود میں لیکر اس کی کنپٹیوں کو آہستہ آہستہ سہلانے لگی، پہاڑی تنے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ الاؤ کے سُرخ ہالے میں پہاڑی کا شکن آلود چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ ٹھوڑی کسی قدر منضبوط تھی اور گردن کی رگیں باہر کو تنی ہوئی تھیں۔ جگدیش کا سانس کبھی دھیما ہو جاتا۔ کبھی تیز چلنے لگتا، کبھی اس میں گر تر گر تر کی سی آواز پیدا ہوتی جیسے کسی گھڑی کو چابی دیتے وقت سنائی دیتی ہے...... لڑکی دھیرے دھیرے کنپٹیاں سہلا رہی تھی، اُس کے سہلانے سے چمر چپڑ چمر کی ایک عجیب خواب آور سی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ میں ادھ مُندی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ

گرجن کی ایک شام

جگدیش پر اس طرح جھکی ہوئی تھی کہ اُس کا آدھا چہرہ اندھیرے میں تھا اور آدھا الاؤ کے ہالے میں میں اس کا چہرہ صاف دیکھ سکتا تھا۔ یہ آرین اور منگول خطوط کا ایک حسین مرقع تھا۔ زعفران اور گلاب کے رنگوں کا اک دلربا امتزاج۔ اُسکے غلافی پپوٹے اس طرح جھکے ہوئے تھے کہ آنکھیں بالکل بند معلوم ہوتی تھیں۔ ذی شئی۔ معاً میرے دل میں خیال آیا کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں۔ یہ ایک خواب ہے۔ یہ جوان لڑکی، یہ پہاڑی بونا، یہ تنگ کا تنا، یہ سُرخ الاؤ، یہ سب کچھ ایک طویل خواب ہے۔ شاید میں اوشا کے بیٹھنے کے کمرے میں صوفے پر لیٹا ہوا اس سپنے کو دیکھ رہا ہوں۔ اور وہ ابھی ابھی ایک نیلی ساڑی پہن کر اندر آئے گی اور مجھے سوتا دیکھ کر اپنی تحقیر آمیز ہنسی سے مجھے جگا دے گی۔ اُٹھو۔ بے فکر اُتو، ساڑھے پانچ بج گئے۔ ایڈی کنٹر کا فلم ..... میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ قدرے توقف کے بعد میں نے پھر آنکھیں کھولیں تو وہی منظر تھا وہی پہاڑی بونا درخت سے پیٹھ لگائے بیٹھا بیٹھا سو گیا تھا۔ لڑکی جگدیش کا سر سہلا رہی تھی۔ جگدیش کا تنفس اب صاف چل رہا تھا۔ الاؤ کا ہالہ تنگ ہو گیا تھا۔ تنگ ہو رہا تھا۔ اونگھتے، جاگتے، پلکیں جھپکتے جھپکتے، اس خوبصورت تصویر کو دیکھتے دیکھتے آہستہ آہستہ یہ سارا منظر ایک سکوں ریز دھند لکے میں غائب ہو گیا۔

جب دوسرے دن آنکھ کھلی، تو نہ جگدیش تھا۔ نہ وہ جوان لڑکی۔ پہاڑی لونا بھی غائب
ہیں اکیلا آسنگ کے وسیع سائے میں لیٹا ہوا تھا۔ کچھ دیر میں یہ خیال جاگزیں رہا کہ
جو کچھ دیکھا تھا محض ایک افسانہ تھا، آنکھیں ملتے ہوئے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔
ے تنے کی کوکھ نظر آئی، پھر دور پرے دھوپ میں ایک ریوڑ چرتا ہوا نظر آیا۔
ارس بندھی، زور سے آواز دی۔

جگدیش —— او جگدیش۔"

ریوڑ میں سے دو ایک بکریوں نے منہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

"جگدیش" میں پھر زور سے چلایا۔ "او جگدیش۔ نامعقول جگدیش۔"

یکایک تنے کی کوکھ سے پہاڑی مسکراتا ہوا نکلا۔ "گرجن دیوتا کی مہربانی سے کل
پ کی جان بچ گئی۔"

میں اُٹھ کر بیٹھ گیا، اور پہاڑی کی طرف تکتے ہوئے کہنے لگا۔ "شکریہ تمہارا اور
اری بہادر لڑکی کا ہزار بار شکریہ۔"

"کیا نام ہے اُس کا؟ ذی شی؟"

"ہاں، ذی شی، اُس کا نام ہے۔ میری ننھی ذی شی بہت اچھی لڑکی ہے۔ گرجن
ا اُس سے بہت محبت کرتے ہیں۔ وہ سب برفیلے راستوں سے واقف ہے۔ اُسے

گرجن دیوتا کبھی کوئی گزند نہیں پہنچنے دیتے۔ چھوٹی عمر ہی میں اُس کی ماں مرگئی تھی گرجن دیوتا ہی نے پالا ہے۔ گرجن دیوتا ذی شی سے بہت محبت کرتے ہیں۔"

ایک گرجن دیوتا پر ہی کیا موقوف ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔ اس سے تو ہر کسی کا دل محبت کرنے کو چاہتا ہے۔ میں نے پہاڑی بونے سے پوچھا۔ "جگدیش کہاں ہے؟"

پہاڑی نے جواب دیا۔ "صبح جب اُن کی آنکھ کھلی تو پاؤں کی موچ بالکل نکل چکی تھی۔ اب وہ ذرا نندن سر تک سیر کرنے کو گئے ہیں۔ ذی شی کو میں نے اُن کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ وہ دونوں اب واپس آتے ہی ہونگے۔ آپ تو خوب سوئے

ہاں میں تو خوب سویا۔ میں نے دل میں سوچا۔ کیونکہ رات بھر کسی نے میری کن پٹیوں پر مالش نہیں کی۔ وہ دونوں؟ یہ لفظ سن کر میرے دل میں ایک نامعلوم سی خلش پیدا ہوئی۔ ایک خفیف سا انتشار، کمبخت جگدیش ہر بار بازی لے جاتا ہے۔ میں نے پہاڑی سے آہستہ سے پوچھا۔ "نندن سر یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"یہی کوئی کوس بھر سیدھے اُس طرف، وہ!"

"اچھا میں بھی نہا دھو آؤں"۔ بوڑھے سے یہ کہہ کر میں چلتا بنا

میں چل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جگدیش نہ تو لارڈ بائرن کی طرح لنگڑا ہے اور نہ ڈان جوان کی طرح حسین۔ پھر بھی یہ کمبخت عورتیں کیوں اس پہ اتنی جلدی فدا ہو جاتی ہیں۔ کیا اس دنیا میں ہم ہی مہاتما گاندھی رہ گئے ہیں۔ آخر ہمارے پہلو میں بھی ایک حساس دل ہے۔ سوز، تڑپ، شعریت سب کچھ ہے۔ مگر اس پر بھی سب ہمیں ایک گھن چکر سمجھتے ہیں۔ آخر یہ تفاوت کیوں؟ جگدیش میں ایسے کونسے لعل لگے ہیں۔ موٹی موٹی آنکھوں پر عینک جما کر مرغے کی طرح چھاتی نکال کر چلنے سے کون سے سرخاب کے پر لگ جاتے ہیں۔ وہ چڑیل اُوشا بھی اس پر مرتی تھی! کمبخت، یونہی سوچتے سوچتے، دل ہی دل میں کڑھتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ کہ یکایک سامنے سے ایک دلکش ہنسی اور پھر ایک بلند قہقہے کی آواز سنائی دی آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو سامنے کے ٹیلے پر سے جگدیش اور وشی چلے آ رہے تھے دونوں نے لمبے سموری فرغل پہن رکھے تھے، دونوں کے سروں پر سموری ٹوپیاں تھیں جن پر ایک طرف کو پیلے پیلے پھولوں کے گچھے بندھے تھے۔ جگدیش کا بلند قہقہہ مجھے بہت ناگوار گذرا۔

"اتنی دیر سوتے رہے؟" جگدیش نے سوال کیا۔ سوال کیا تھا۔ سراسر تضحیک تھی۔

"اتنی جلدی جاگ اُٹھے؟" میں نے جواب دیا۔ جواب کیا تھا سراسر طنز تھی۔

"نہانے چلے ہو؟" جگدیش نے پوچھا۔

"پاؤں کی موچ نکل گئی ہے کیا؟" میں نے جواب دیا۔

"ذی شی نے ایک دلکش قہقہہ لگایا، اور اپنا بایاں بازو میرے بازو میں ڈال کر کہنے لگی "آؤ ہم تینوں واپس نندن سر کو چلیں جب ہم نندن سر کو چلے تو جگدیش اپنی عینک صاف کر رہا تھا۔ اور میں دل میں کہہ رہا تھا کہ اے پُر فن حسینہ تو نے اسوقت، تو ہم دونوں کو خوش کر دیا لیکن جلد یا بدیر تجھے اس امر کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ تو ہم دونوں میں سے کس کو چاہتی ہے؟

اور جلدی اس امر کا فیصلہ ہو گیا، میں نندن سر پہ نہاتا رہا۔ اور وہ دونوں پھولوں کے تختوں میں نیم پنہاں خدا جانے کیا باتیں کرتے رہے، کبھی کبھی ہنس پڑتے، پھر کان ہی کان میں ایک دوسرے کو کچھ کہتے، ایک دوسرے کی طرف پھول توڑ توڑ کر پھینکتے۔ جگدیش نے خدا جانے اُسے کیا کہا کہ ذی سی یکایک بھاگ اٹھی۔ جنگل کی مست ہرنی کی طرح، جگدیش اُس کے پیچھے اُٹھ کر دوڑنے لگا۔ ہاں واقعی پاؤں کی موچ نکل چکی تھی۔ پھولوں کے تختوں میں اُس نے کئی چکر کھائے۔ مگر ذی شی کہاں اُس کے قابو میں آتی تھی۔ اور اس کے لانبے

گرجن کی ایک شام

سیاہ بال ہواؤں میں لہرا رہے تھے۔ وہ بھاگتی ہوئی پھولوں کے تختوں سے پرے ٹیلوں پر سے چھلانگیں لگاتی ہوئی دُور نکل کر نظر سے اوجھل ہوگئی۔ جگدیش بھی بھاگتا بھاگتا نظروں سے غائب ہوگیا۔ اب میرے سامنے صرف سمور کی دو ٹوپیاں پڑی تھیں اور پھولوں کے مَسلے ہوئے تختے۔ یخ کی طرح سرد پانی نے جسم اکڑا دیا تھا۔ اور ہونٹ نیلے کر دیئے تھے۔ میں نہا کر بہت دیر تک دھوپ تاپتا رہا۔ آج گرجن دیوتا کی چوٹی پر بادلوں کا نشان بھی نہ تھا۔ میں پہاڑ پر اس سلوٹ کو ڈھونڈنے لگا۔ جس کے اندر خیمہ تھا۔ لیکن وہ سلوٹ یہاں سے نظر نہ آتی تھی جگدیش اور ذی شی کہاں گئے۔ یہ سوچ کر میرا منہ لال ہوگیا۔ اب تو گرجن کو ہی اپنی قیام گاہ بنانا ہوگا، آج ریوا کو کہنا ہوگا کہ مزدوروں کو ساتھ لیکر جائے اور خیمہ اور دیگر سامان اٹھوا کر یہاں لے آئے۔ اس برفانی سلوٹ سے یہ تنگ کی پسنی زیادہ محفوظ جگہ ہے اور اگر کل کی طرح ایک اور ایسی ہی برفانی اور طوفانی شام آگئی تو گرجن دیوتا کی بد دعا پوری ہو جائے گی۔

اب بدن اچھی طرح سے گرم ہوگیا تھا۔ آنکھوں میں غنودگی سی آنے لگی تھی۔ دماغ میں جیسے شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں میں نے اُٹھ کر کپڑے پہنے اور چلنے لگا۔ راستے میں پھر مجھے جگدیش اور ذی شی مل گئے۔ ذی شی کے رخسار دل

کی لالی بڑھ گئی تھی۔ اُس کی آنکھیں نیچی تھیں۔ جگدیش کی چھاتی ضرورت سے زیادہ باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ ایک نئے بھرتی شدہ لفٹننٹ کی طرح، اِس بار ذی شی نے چلتے چلتے میرا ہاتھ نہیں پکڑا۔ میں نے اپنے دل کو سمجھایا۔ بیٹا صبر کرو۔ رو نے دھونے سے کیا ہوتا ہے۔ ایسے ایسے کئی چرکے تم کھا چکے ہو۔

گرجن میں زندگی ایک سپنے کی طرح گذرتی ہے۔ اِس سپنے میں ریشمیں گھاس کے بے شمار قطعے ہیں۔ ان قطعوں کے اندر کہیں کہیں تنگ کے درخت ہیں۔ ان تنگ کے درختوں کے نیچے گڈریے اور اُن کے ریوڑ رہتے ہیں۔ دن بھر ریوڑ سبزے کے قطعوں میں گھاس چرتے ہیں۔ کودتے ہیں۔ ناچتے ہیں۔ میں میں بابا کرتے ہیں۔ کبھی ناکام رہتے ہیں تو ایک دوسرے کو سینگ مار مار کر لہو لہان کر دیتے ہیں۔ گڈریے مینڈھوں کو لڑاتے ہیں۔ شرطیں بدتے ہیں۔ ہارتے ہیں۔ جیتتے ہیں۔ الغوزے بجاتے ہیں۔ شکنجہ کھیلتے ہیں۔ پھر جب شام ہو جاتی ہے اور مغربی اُفق کی آخری لال دھاری تاریکی میں گم ہونے لگتی ہے تو ریوڑوں کو واپس تنگ کے درختوں تلے لے آتے ہیں۔ الاؤ کے ارد گرد بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں کھانے میں دودھ شامل ہوتا ہے اور مکھن اور مکئی کی روٹی۔ کبھی نمک یا گڑ یا نیچے کی بستیوں سے کبھی کبھی پیاز اور سُرخ مرچیں بھی آجاتی ہیں۔ ورنہ اکثر دہی دودھ اور مکئی کی روٹی۔

دہی اور مکھن، پنیر، گرجن میں ہر چرواہے اور چرواہی کے جسم سے پنیر کی سوندھی سوندھی بُو آتی ہے۔ جو اکثر شہری طبیعتوں کو بہت بُری معلوم ہوگی۔ پسند اپنی اپنی اغازہ اور پوڈر اور لپ سٹک کی جگہ چرواہیاں یہی دودھ مکھن استعمال کرتی ہیں تیل کی جگہ بھی مکھن۔ یہاں مٹی کے برتن بہت کم ہوتے ہیں۔ دودھ کھالوں میں دوھ کر رکھا جاتا ہے۔ دودھ دوہتے وقت چرواہیاں شرطیں بدتی ہیں۔ کس کی بکری زیادہ دودھ دیتی ہے؟ کون زیادہ دودھ کی دھاریں اپنے مُنہ میں ڈال سکتی ہے۔ نیم گرم دودھ کی تازہ دھاریں جب پیاسی زبان سے جا لگتی ہیں تو دل کو وہ فرحت نصیب ہوتی ہے کہ چائے اور کوکو سب بھول جاتے ہیں۔ میرے خیال میں زندگی کا بہترین مصرف یہ ہے کہ آدمی بارہ ہزار فٹ کی بلندی پہ ایک تنگ کے درخت کے تلے رہے۔ بکریاں چرائے۔ الغوزے بجائے اور تازے دودھ کی دھاروں سے مشامِ جان کو ہر دم تازہ رکھے۔ دودھ سے مکھن نکالنے کا طریقہ بھی بہت عجیب ہے۔ یہاں نہ مٹی کی مٹکی ہے نہ بلونا۔ بس ایک کھال میں اس کے نصف حجم کے برابر دودھ ڈال دیا جاتا ہے۔ اور ایک چرواہی اس کھال کو اچھی طرح سے بند کر کے ایک پھکنے کی طرح گھاس پر لٹا دیتی ہے۔ اور پھر جس طرح آٹا گوندھا جاتا ہے۔ اُس طرح کھال کو اپنے ہاتھوں سے بار بار گوندھتی

ہے۔لٹیں بکھری ہوئی ہیں۔چہرہ لال ہے۔آنکھوں میں چمک ہے۔زبان پر ایک پہاڑی گیت ہے اور کھال گوندھے جارہی ہے۔کوئی ایک آدھ گھنٹے کے بعد کھال کے اندر دودھ اور مکھن الگ الگ ہو جاتے ہیں۔دودھ الگ دوسری کھال میں ڈال لیا جاتا ہے اور مکھن ہاتھ سے اُتار لیا جاتا ہے۔دودھ خالص بھی ہوتا ہے اور گاڑھا بھی۔اس دودھ میں پانی کم اور مکھن زیادہ ہوتا ہے اور جب پیو تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔گویا شیریں مکھن کا سیال ہے کہ گلے میں اترتا جارہا ہے۔اس دودھ کو پی کر نیند بہت آتی ہے۔ساری زندگی ایک سپنا معلوم ہوتی ہے اور دراصل گرجن ہے بھی ایک سپنا ہی۔ورنہ ایسے ایسے مقام تو اب ناپید ہوتے جارہے ہیں۔اب تو دنیا تلخ حقیقتوں سے بھری جارہی ہے۔نقلی دودھ اور نقلی محبت، اور نقلی انسانیت، اور پھر زندگی کارخانے سے گھر کے گندے صحن میں اور گندے صحن سے کارخانے کے گندے ورکشاپ تک محدود رہتی ہے۔اس زندگی میں بچے پیدا ہوتے ہی بوڑھوں کی سی باتیں کرنے لگتے ہیں۔لیکن گرجن میں ابھی تک ہر بوڑھا اور نوجوان بچپن کی معصومیت کو لئے ہوئے ہے۔الاؤ کے چٹخنے ہوئے کوئلوں کی مدھم روشنی میں چرواہیاں اُون سے کچھ بُن رہی ہیں۔تکلی گھوم رہی ہے۔اُن کی باہیں اور چہرے اور آنکھیں ایک خاص ترتیب سے

حرکت کرتی ہیں، جیسے یہ کھن کی پتلیاں ہیں۔ ایک چرواہا کہانی سنا رہا ہے۔ ریمی کی کہانی تم نے سنی ہے۔ ریمی گرجن کی سب سے حسین لڑکی تھی۔ وہ تنگوں کے سایوں میں پل کر جوان ہوئی۔ اور ننندن سر کی نیلی جھیل کا عکس اس کی دل کش آنکھوں میں چمکتا تھا۔ اسکی جبیں گرجن کی برف کی طرح سپید تھی۔ اور ڈوبتے ہوئے سورج نے اُسکی گالوں کو چوم کر انہیں ایک جادوائی چمک عطا کی تھی ایسی لڑکی کسی دیوتا ہی سے بیاہنے کے لائق تھی۔ کسی چرواہے کو اُس سے محبت کرنے کی جرأت نہ ہونی چاہیئے تھی۔ گرجن دیوتا کا سایہ اُس پر تھا وہ اکثر دن بھر اکیلی گھومتی تھی۔ کبھی کبھی وہ بے خوف وخطر گرجن کی سب سے اُونچی چوٹی پر چلی جاتی۔ شاید اس نے دیوتا کے درشن کر لئے تھے۔ وہ اپنے ماں باپ کو بہت پیاری تھی۔ لیکن افسوس وہ اُسے کسی سے بیاہ نہ سکتے تھے۔ واٹو ایک معمولی چرواہا تھا۔ لیکن اُس نے ریمی سے عشق کیا۔ وہ جان بوجھ کر موت کے منہ میں جا رہا تھا۔ اسے کئی بار سمجھدار بوڑھے چرواہوں نے سمجھایا۔ لیکن وہ نہ مانا۔ گرجن دیوتا نے بھی اُسے کئی بار سمجھایا۔ کہانی سنانے والے چرواہے کو معلوم تھا کہ ایک بار واٹو کو لک سر کی گھاٹی میں گرجن دیوتا ملے تھے۔ چاندنی رات تھی۔ اور گھاٹیاں اور چوٹیاں اور میدان ایک روپہلی خاموشی میں کھوئے ہوئے تھے۔ نہ ہوا تھی، نہ نغمہ، نہ بادل

اور اس خاموش بے حس و حرکت کائنات میں صرف دو دل دھڑک رہے تھے۔ ریمی اور واٹو۔ واٹو اور ریمی اور واٹو نے جرأت کرکے ریمی کا ہاتھ پکڑ لیا تھا عین اُسی وقت واٹو کو سامنے ایک سپید برف کا گولا ہوا میں اڑتا ہوا نظر آیا۔ اس نے گھبرا کر ریمی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ گولا ہوا میں اُڑتا ہوا آسمان کی طرف پرواز کرنے لگا۔ اور پھر اُس کے سامنے زمین سے آسمان تک برف کی ایک لکیر سی کھنچ گئی تھی، ریمی کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ سپید۔ اور واٹو اس لکیر کو دیکھ کر کانپنے لگا لیکن وہ ریمی کی محبت سے دستبردار نہ ہوا۔ گرہن دیوتا نے اُسے ایک بار پھر سرزنش کی۔ کہانی سنانے والے چرواہے کو معلوم تھا کہ کس طرح واٹو کو گرہن دیوتا نے رات بھر طوفان میں گھیرے رکھا تھا۔ واٹو کو اُس بھیانک رات میں کبھی کبھی گرہن دیوتا کی خشمگیں آواز سنائی دیتی۔ ریمی کی محبت سے باز آ، ریمی تیری نہیں ہو سکتی۔ کبھی کبھی اُسے بھیڑ بکریوں کی آوازیں سنائی دیتیں۔ کبھی کبھی کوئی جلتا ہوا الاؤ کسی تنگ کے نیچے نظر آ جاتا۔ لیکن یہ سب گرہن دیوتا کے کرشمے تھے، وہ رات بھر طوفان میں گھرا رہا، اور جب دوسرے دن وہ گھر پہنچا تو لوگوں نے دیکھا کہ اُس کی ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی تھی اور اس کے پاؤں کے انگوٹھے ہمیشہ کے لئے نیلے ہو گئے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ اُسی شدت سے ریمی سے محبت کرتا رہا۔

"پھر کیا ہوا؟" ایک چرواہے نے کانپتے ہوئے پوچھا۔

بس گرجن کی کہانیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ان میں محبت ہوتی ہے۔ بچپن کے ہوائی قلعے، معصوم توہمات اور قدرت کے ہیبت ناک مناظر۔ ان کہانیوں میں نہ فن کاری ہوتی ہے۔ نہ عروج، نہ پلاٹ، گڈریہ جو جی میں آئے کہتا چلا جا رہا ہے کہانی آپ ہی آپ بنتی چلی جا رہی ہے۔ جیسے ریشم کے کیڑے کے منہ سے ایک خوبصورت کویا تیار ہو جاتا ہے۔ اس طرح کہانی کہنے والے کی زبان کہتی چلی جا رہی ہے اور کہانی تیار ہوتی جا رہی ہے۔ یہ کہانی اُس کہنے والے نے بھی پہلے کبھی نہیں سُنی۔ اُسے خود معلوم نہیں "پھر کیا ہوا؟" لیکن وہ کہانی کہتا چلا جا رہا ہے۔ اور رات کے سناٹے میں۔ الاؤ کی روشنی میں، اُون بُنتی ہوئی چرواہنوں کے جھرمٹ میں وانو اور ریمی کے حسین پتلے تخیل کے شبستان میں اُجاگر ہو رہے ہیں۔

لیکن ریوا کو شاعری سے دلچسپی نہیں۔ وہ کہانیاں سننا نہیں چاہتا۔ اُسے اعتراض ہے کہ کیوں ہم نے پہاڑ کی بلندیوں کو چھوڑ کر یہ پستی اختیار کی ہے۔ اُس کی شاہیں کی سی نگاہیں شکار کی تلاش میں زیادہ خوشی محسوس کرتی ہیں۔ اُسے یہاں کی مکھن کی ٹکیوں یا الغوزے بجاتے ہوئے گڈریوں۔ یا گرجن دیوتا کی بہیمانہ حرکتوں سے ذرا بھی دلچسپی نہیں، وہ قدرت سے، طوفان سے۔ موت سے

ایک بہادر سپاہی کی طرح مقابلہ کرنا جانتا ہے۔ اُسے معلوم نہیں کہ اُوشا کی بے وفائی نے میرے دل میں کیا آگ لگا رکھی ہے اور اب گرجن کی برفانی وادیوں میں ایک نئے الاؤ کے شعلے لپکنے لگے ہیں۔ وہ صرف ایک خوشبو کی تعریف کرنا جانتا ہے۔ جب وہ کبھی رونسے کو زخمی کر کے فوراً اُس کے نافے پر زور سے ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ نافے کی تھیلی میں سے خوشبُو کی لپٹیں نکلتی ہیں۔ ہرن جانکنی کی حالت میں ہے۔ زندگی نافے میں سے خوشبو کی لپٹیں بن کر نکل رہی ہے۔ ریوا اپنے شکار پر جھکا ہوا ہے۔ نافے کو مضبوطی سے پکڑ کر اور اُسے چاقو سے چیر کر جسم سے الگ کر ڈالتا ہے۔ کہتے ہیں اگر نافے ہرن کا شکار کرتے ہوئے فوراً ہی اس تھیلی کو نہ پکڑ لیا جائے تو سارا نافہ ہرن کے جسم میں جذب ہو جاتا ہے۔ اور تھیلی میں ذراسی بھی خوشبو نہیں رہتی۔ اور نافہ نافہ نہیں رہتا، بلکہ محض جھلی کی ایک پوٹ۔ ریوا صرف نافے کی تعریف کر سکتا ہے۔ پنیر کی سوندھی خوشبو سے اُسے گھن آتی ہے۔ ذی شی کے بالوں۔ ذی شی کے کپڑوں اور ذی شی کے جسم میں بھی یہی پنیر کی سوندھی خوشبو رچی ہوئی ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ جگدیش ایک صاحب ہو کر بھی کیونکر ذی شی سے عشق کر سکتا ہے۔ خود جگدیش کو بھی اس نئے جذبے پر حیرانی سی تھی۔ اُس نے اکثر۔ بلکہ ہم دونوں نے اکثر ـــــ پہاڑی عورتوں سے

عشق کیا تھا۔ اور یہ عشق ہمیشہ چند رو پہلی حفاظتی تدبیروں اور دو ایک ریشمی رومالوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ کبھی ہم اسے شعری جذبہ کہتے تھے۔ کبھی وقتی شادی لیکن ہوتا یہی کچھ تھا۔ یعنی ٹک دیکھ لیا، دلشاد کیا، لیکن یہ کس بلا خیز طوفان کی آندھی کہ ذی شی کو دیکھتے ہی جگدیش اُس میں ایسا کھو جاتا تھا کہ ذی شی کے سوائے اسے دنیا کی کوئی اور چیز اچھی نہ لگتی تھی۔ یہاں نہ جہیز کا سوال تھا۔ نہ تعلیم کا، نہ آداب کا اور ذی شی ان سب باتوں سے بیگانہ تھی۔ پھر بھی جگدیش اس بے وقوفی پر تلا ہوا تھا۔ وہ ذی شی سے شادی کرنا چاہتا تھا، شادی! سمجھتے ہو دوست؟ جگدیش اُس بے باک پہاڑی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا جس نے صوفے کی شکل تک نہ دیکھی تھی، جس کے باپ کے پاس ایک گز زمین بھی نہ تھی جس کی انگلیوں میں ایک چاندی کی انگوٹھی بھی نہ تھی۔ جس کے اطوار وحشی پرندے کی طرح تھے۔ گرجن دیوتا اس سے زیادہ بد دعا اور کسی کو نہ دے سکتے تھے۔ لیکن جگدیش بے بس تھا۔ میں اُسے کئی بار سمجھاتا، پاگل ہوئے ہو؟ گرجن کی زندگی خانہ بدوش گڈریوں کی زندگی ہے۔ لیکن انسان ایسی قبائلی زندگی سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ وہ تنگ کے درختوں تلے نہیں رہتا۔ بلکہ شہر بسا کر رہتا ہے وہ صرف مکھن اور پنیر پر قناعت نہیں کرتا۔ بلکہ زندگی کی صدہا لذتیں اُسے میسّر

ہیں۔ ذی شی پہاڑی لکی ہے۔ میدانوں میں تمازت آفتاب سے فوراً جھلس جائے گی۔ تم خود اس سے نفرت کرنے لگو گے۔ کیا سمجھتے ہو؟ جس نظام میں تم رہتے ہو۔ اُس میں اس قسم کی عورت ایک دن بھی بمشکل گذارا کر سکے گی۔ گھٹ کر مر جائے گی۔ شہری زندگی کا آسمان بہت تنگ ہوتا ہے اور زمین بھی نپی تلی ہوئی۔ وہاں نہ برفانی چوٹیاں ہوتی ہیں۔ نہ سر سبز مرغزار۔ ذی شی تو ایک عجائب گھر میں رکھے جانے کے لائق ہے نہ کہ تمہاری بیوی ہونے کے لائق۔ اور پھر آجکل شادی میں محبت کو کیا دخل۔ قبائلی زندگی میں محبت ہو سکتی تھی۔ لیکن موجودہ زندگی میں اور اس کے زمینی نظام میں محبت کو کیا دخل۔ اس دنیا میں ایک اونٹ کو سوئی کے ناکے سے گذارا جا سکتا ہے لیکن محبت کے جذبے کو اس دنیا میں داخل نہیں کیا جا سکتا۔ جب گرجن سے واپس جاؤ گے اس وقت میری باتوں کی قدر معلوم ہو گی۔ اُس وقت تمہیں اُوشا یاد آئے گی۔ ذی شی تو سینما بھی نہیں دیکھ سکتی۔ کیا بچوں کی سی باتیں کرتے ہو؟ جگ ہنسائی ہو گی۔ لوگ کہیں گے جگدیش چڑیا گھر سے ایک جانور پکڑ لایا ہے لیکن جگدیش بے بس تھا۔ شاید عمر میں پہلی بار اُسے کسی سے محبت ہوئی تھی۔ وہ محبت جو چند روپوں چند حفاظتی تدبیروں اور ریشمی رومالوں پہ مشتمل نہ تھی۔ یہ کسی انوکھی آگ کا شعلہ تھا جو اُس کی روح کے ہر کونے میں کوندتا ہوا معلوم ہوتا

تھا۔ یہ کسی کے بس کا روگ نہ تھا۔ اب جگدیش اور ذی شی اکثر اکٹھے رہتے تھے۔ پہلے پہل ذی شی ہم تینوں کے ساتھ شکار کے لئے جاتی تھی۔ اُس نے بندوق چلانا بہت جلد سیکھ لیا تھا۔ اور کچھ دنوں سے تو وہ ایک مشاق شکاری بن گئی تھی۔ جس کی نگاہیں ریوا کی عقابی آنکھوں سے تیزی میں کچھ ہی کم تھیں۔ لیکن اب جگدیش اور ذی شی اکثر اکیلے شکار کو جاتے تھے۔ اور ریوا اور میں اکثر مخالف سمت میں جایا کرتے۔ لیکن کبھی کبھی کسی گھاٹی کی تنگنائے میں ہمارا میل ہو جاتا وہ باہوں میں باہیں ڈالے چلے آ رہے ہوتے۔ اُن کے کاندھوں پر بندوقیں ہوتیں۔ جھولوں میں دن بھر کا شکار، نگاہوں میں ایک دوسرے کے لئے بے اندازہ محبت۔ کبھی کبھی میں انہیں دن ڈھلے کسی گھاٹی کی اُونچی چٹان پر کھڑے دیکھ لیتا۔ ان کی پشت میری طرف ہوتی۔ جگدیش کا ہات ذی شی کی کمر میں ہوتا۔ اور ذی شی کا سر جگدیش کے کندھے پر، بندوقوں کی سیاہ نالیں درختوں کے تنوں کی طرح نظر آتیں جس سے وہ سہارا لئے کھڑے ہوتے۔ وہ نیچے اُن وادیوں کی طرف تاک رہے ہوتے جہاں شام کی دھند پھیلتی جا رہی تھی۔ اور سورج کا پگھلا ہوا سونا دھند کی سفید لہروں پر تیرتا ہوا نظر آتا۔ ساری فضا میں خاموشی ہوتی اور اس روپہلی خاموشی میں صرف دو دل دھڑک رہے ہوتے

میں ان دلوں کا گیت سُن سکتا تھا۔ یکایک ریوا بندوق سیدھی کرتا اور "ٹھائیں" کی آواز کے ساتھ ایک سہنولہ زمین پر آ گرتا۔ جگدیش اور ذی شی چونک جاتے جیسے اُن کے سنہرے سپنے کے تار تھرّا اُٹھے ہوں۔ بندوق کی گرج گھاٹیوں میں بار بار گونجتی ہوئی پھیلتی جاتی۔ جیسے گرہن دیوتا گرج رہے ہوں۔

جگدیش بے بس تھا۔ لیکن یہ جانتا ضرور تھا کہ یہ محبت میدانوں میں پنپنے کی نہیں وہ اس سندر سپنے کو ابدی بنانا چاہتا تھا۔ لیکن سپنے آخر سپنے . . . ہوتے ہیں ان کی اپنی فضا ہوتی ہے۔ ان کی اپنی دنیا ہوتی ہے اور جب یہ ہماری دنیا سے ٹکراتے ہیں تو پانی کے بلبلے کی طرح چٹخ کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور آواز بھی نہیں آتی۔ کئی لوگ اس دنیا میں سندر سپنوں کو ابدی بنانا چاہتے ہیں سچی محبت، سچی انسانیت، سچی اخوت۔ سچی مساوات..... پانی کے بلبلے ......وہ اس دنیا کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ نہیں جانتے کہ یہ چیزیں اس دنیا کی فضا میں نہیں پھل پھول سکتیں۔ ان کے لئے ایک نئی فضا کی ضرورت ہے۔ ان کے لئے ہمیں اس ساری دنیا کو حرفِ غلط کی مٹا دینا ہو گا۔ اور ایک نئی دنیا آباد کرنا ہو گی۔ جگدیش جانتا تھا کہ یہ کہنا آسان ہے۔ لیکن کرنا بہت مشکل۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جگدیش نے واقعی اپنے سندر سپنے کو ابدی کر لیا۔ مجھے وہ طوفانی رات نہیں بھولتی جب اُسی تنگ کے درخت کے نیچے میں، ریوا اور بوڑھا بونا رات بھر جگدیش اور ذی شی کا انتظار کرتے رہے تھے برفانی ہواؤں کے فراٹوں نے ریوڑ کو اس طرح اکٹھا کر دیا تھا کہ وہ سب غریب جانور ایک دوسرے کی تھوتھنیوں میں منہ چھپائے پڑے تھے اور کراہ رہے تھے تنگ کے باہر طوفان گرج رہا تھا۔ اور بجلی کے پُرپیچ حلقے زمین پر آگ کے بگولوں کی طرح چلتے نظر آتے۔ ایک جہنمی منظر تھا۔ جس میں بادلوں کی گرج۔ ہوا کی وحشیانہ چیخیں اور چوٹیوں پر سے گرتی ہوئی برف کے بھیانک قہقہے سنائی دیتے تھے۔ ریوا نے صبح سویرے ہی آنے والے طوفان کے متعلق ہم سب کو متنبہ کر دیا تھا لیکن جگدیش اور ذی شی نے ہنس کر بات ٹال دی تھی۔ ذی شی تو طوفانوں سے مطلق نہ ڈرتی تھی۔ اور اس کے علاوہ اُس دن وہ کسی رد نسے کا شکار کرنا چاہتی تھی۔ رد نسے گرجن پہاڑ کی چوٹیوں پر گھوم رہے تھے۔ جگدیش اور ذی شی دونوں رخت سفر باندھ کر شکار کے لئے صبح ہی اُن خطرناک بلندیوں کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ جہاں پہلے اُن کا کیمپ تھا اور میں نے اور ریوا نے انہیں رومال ہلا ہلا کر الوداع کہی تھی۔

یہ آخری الوداع تھی۔ اُس رات گرجن کے خوفناک دیوتا نے اپنے محبوب کو اپنی یخ بستہ چھاتی سے ہمیشہ کے لئے لپٹا لیا اور اپنے رقیب کے سینے میں وہی بجلی گھونپ دی جو رات بھر آگ کے پُرپیچ حلقوں میں گردش کرتی رہی تھی۔ یہ گرجن دیوتا کا انتقام تھا! دوسرے دن جب ہم چندا اور گڈریوں کو ساتھ لے کر انہیں ڈھونڈنے کے لئے نکلے تو ہم نے انہیں پہاڑ کی بلندیوں پر ایک سلوٹ کے نیچے مردہ اور یخ بستہ پایا۔ جگدیش کی آنکھیں کھلی تھیں اور ذی شی کی آنکھیں بھی کھلی تھیں اور وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے دیکھتے مر گئے تھے۔ ذی شی برف پر لیٹی ہوئی تھی اور جگدیش اس کا سر اپنے زانو پر رکھے تھا۔ اور سلوٹ کے کناروں سے رات بھر پانی رستا رہا تھا اور اُس نے اُن دونوں کے گرد ایک نیلم کی قبر بنا دی تھی۔ ذی شی کی آنکھیں گہری نیلی تھیں جیسے نندن سر کی جھیل اور جگدیش کی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں اُن کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے جگدیش کی آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھا۔ آہ! ان گہرائیوں کا الم کسی بے کس زخمی، سسکتے ہوئے آہو کی فریادوں کا آئینہ دار تھا، ہرن جانکنی میں تھا اور زندگی نافے میں سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھی۔ جب سندر سپنے اس دنیا سے ٹکراتے ہیں تو پانی کے بلبلے کی طرح چیخ کر ٹوٹ جاتے ہیں.....

تنگ کے دائرے سے باہر گھپ اندھیرا تھا۔ الاؤ کے تنگ ہالے میں ریوڑ سویا ہُوا نظر آتا تھا۔ چرواہیاں تکلی پھراتی ہوئی اُون سے کچھ بُن رہی تھیں۔ چرواہے محویت کے عالم میں ہاتھوں میں ٹھوڑیاں لئے ایک کہانی سُن رہے تھے۔ کہانی سنانے والا چرواہا کہہ رہا تھا۔"بہت دن گذرے اس تنگ کے درخت کے نیچے ایک پہاڑی بونار ہتا تھا۔ اُس کی لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ اُس کا نام تھا ذی شی۔ ذی شی گرجن دیوتا کی منظورِ نظر تھی۔ ایک دن کیا ہُوا کہ اسی تنگ کے درخت کے سائے میں تین شکاری آکر بیٹھے......"

ایک چرواہی نے سانس روک کر پوچھا۔"پھر کیا ہُوا؟"

بالکونی

میں جس ہوٹل میں رہتا تھا اُسے 'فردوس' کہتے تھے، یہ ایک سہ منزلہ مکان تھا اور چیل کی لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ دُور سے ہوٹل کے بجائے کوئی پُرانا جہاز معلوم ہوتا تھا۔ میرا کمرہ درمیانی منزل کے غربی کونے پر تھا، اور اس کی بالکونی میں سے گلمرگ کا گاف کورس، نیڈوز ہوٹل' اور دیودار کے درختوں میں گھرے ہوئے بنگلے' اور اُن کے پرے کھلن مرگ کا اُونچا میدان اور اُس سے بھی پرے الپتھر کی چوٹی صاف نظر آتی تھی، گلمرگ کی شفق مجھے بہت پسند ہے اور یہاں سے تو شفق کا منظر بہت بھلا معلوم ہوتا تھا، اِس لئے بھی میں نے اِس کمرے میں رہنا پسند کیا۔ بہت سے لوگ جو یونہی بے سوچے سمجھے کمرے کرائے پر لے لیتے تھے بعد میں میری بالکونی کی طرف بہ اندازِ حسرت دیکھتے اور اکثر مجھ سے اجازت طلب کر کے میری

بالکونی میں غروبِ آفتاب کا نظارہ کرنے آیا کرتے، اس طرح ملاقات بہت سے ایسے لوگوں سے ہوگئی، جن کا میں ابھی اس خط میں ذکر کردوں گا، اِن لوگوں میں بینکر بھی تھے، اور تجار بھی، ٹھیکیدار بھی تھے، اور پانچ بچوں والی مائیں بھی، طالب علم بھی تھے اور طالبِ دیدار بھی، طرح طرح کے لوگ، مرہٹے، ایرانی، اینگلو انڈین، ڈوگرے، پنجابی، دہلوی، مختلف زبانیں، مختلف لباس عجیب عجیب باتیں، انوکھے تبسم، نرالے قہقہے، کائنات کی ساری بوالعجبی اُس بالکونی میں اکٹھا ہوگئی تھی اور یہ سب عجیب لوگ غروبِ آفتاب کا منظر دیکھنا پسند کرتے تھے۔ یہ بڑے غیر رومانی لوگ تھے۔ ان کی زندگی کا نصب العین روپیہ تھا، لیکن یہ لوگ اکثر حالتوں میں دو ہزار میل چل کر گلمرگ کی شفق دیکھنے آئے تھے۔ مشینی دور میں ہر انسان روپیہ چاہتا ہے، سرمایہ داری نے اُس کی زندگی کو تلخ، اُس کے دل کو کمینہ، اُس کی روح کو غلیظ بنا دیا ہے۔ لیکن خوبصورتی کی حس ابھی مٹی نہیں، وہ انسان کی کائنات کے کسی گوشے میں کسی زخمی رگ کی طرح ابھی تک تڑپ رہی ہے، نہیں تو شفق دیکھنے کے لیے اس قدر بیقراری کیوں؟ وہ لوگ شام کو شفق دیکھتے تھے اور میں اُن کے چہروں کو دیکھتا تھا۔ وہی چہرے جو ان میں پژمردہ، بھوکے اور مخوف سے نظر

آتے تھے۔ اس وقت کسی انجان، ان دیکھے نور کی تابانی سے چمکتے ہوئے معلوم ہونے تھے، اُن کے چہروں کی خباثت اور آنکھوں کی مجرمانہ کیفیت اک عجیب، پرسکون، سحر طراز مسرت میں مبدل ہوجاتی تھی، وہ اُس شفق کو ایسی گرسنہ نگاہوں سے دیکھتے۔ جیسے بچے تصوّر میں اپنی پریوں کی شہزادی کے محل کو دیکھتے ہیں، اور وہ عورت جو پانچ بچوں کی ماں تھی، اور جس کے چہرے پر اُس کے خاوند کی ظالمانہ بھوک نے چھائیاں پیدا کردی تھیں، اپنے لٹے ہوتے حسن کو دوبارہ حاصل کرلیتی تھی، اور اُس وقت اُس کے ادھ کھلے ہونٹوں کی چمک اور رخساروں کی پھبن اُسے واقعی کسی پرستان کی ملکہ بنا دیتی تھی یہ امر کس قدر مسرت زا ہے، کہ انسان کے دل میں ابھی تک وہ اضطراری شعلہ تڑپتا ہے، اُس کے دل کا شاعر اُس کے تصوّر کا بچہ اُس کے پرستان کی ملکہ ابھی تک زندہ ہے، اور جب تک وہ زندہ ہے انسان بھی زندہ ہے، سرمایہ داری، ظالم سماج، ملوکیت پرستی، فسطائیت دنیا کا ظالم سے ظالم نظام بھی اُسے مٹا نہیں سکتا، میں انسان کے مستقبل سے نااُمید نہیں ہوں۔

فردوس امیر سیاحوں کی نظر میں ایک گھٹیا، سستا سا ہوٹل تھا،

لیکن میرے لئے پھر بھی مہنگا تھا۔

لیکن کیا کرتا کسی ہندوستانی ہوٹل میں جگہ خالی نہ تھی، ناچار یہاں آنا پڑا۔ فردوس میں جو لوگ اقامت پذیر تھے اُن میں آدھے سے زیادہ مغربی تھے۔ اور باقی ایشیائی، بیرے ایک عجیب قسم کی زبان بولتے تھے، جو نہ انگریزی تھی، نہ ہندوستانی، بلکہ دونوں کے ناجائز تعلق سے پیدا ہوئی تھی کھانا چھری کانٹوں کے ساتھ کھایا جاتا تھا۔ لیکن اکثر چھریاں کند ملتیں، اور کانٹے غیر ملمع شدہ، اور شوربے میں ہندوستانی کھانے کی طرح سرخ مرچوں کی اتنی بھرمار ہوتی کہ بیچاری لنکاشائر کی رہنے والی آیاؤں اور نرسوں کی زبان جلنے لگتی، اور وہ ہوٹل کے بڑے بیرے کو ایسی صلواتیں سناتیں کہ وہ خوشی سے اپنی چھاتی کا اُبھار اور بھی بڑھا لیتا، بیرے کی مسرت کا راز یہ ہے کہ اُسے جتنی گالیاں ملیں وہ اتنا ہی خوش رہتا ہے، اور بیرہ جتنا بڑا ہو۔ اُسے اُتنی ہی بڑی گالی چاہیئے ورنہ وہ ناخوش رہے گا اور دو ایک دن کے بعد اُداس ہو کر ہوٹل سے چلا جائیگا۔ گالی اور بخشیش بیرے کی زندگی کے محور ہیں۔ کبھی اُسے پہلے گالی ملتی ہے اور پھر بخشیش، کبھی پہلے بخشش بعد میں گالی، ہر حالت میں وہ خوش رہتا ہے۔ اور انگریزی سیاست کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے، کہ وہ اپنے

بیروں سے ہندوستانی قوم کا اندازہ کرتے ہیں۔ وہ پوری ہندوستانی قوم سے اپنے بیروں کا سا سلوک کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہندوستانی بھی اُن سے اُن کے بیروں کی طرح خوش رہیں لیکن ہندوستانیوں کی کور ذوقی کا کیا کیا جائے کہ وہ کسی حالت میں بھی مطمئن نظر نہیں آتے۔ وہ نہ گالی پسند کرتے ہیں نہ بخشش۔

ہوٹل کا منیجر ایک مسلمان کشمیری تھا۔ نام تھا احد جو۔ دُبلا پتلا کشمیری، بی۔ اے پاس، لبوں پر نا امیدی کی راکھ، آنکھوں میں اُن تمام خوابوں کی حسرت جو پورے نہ ہوئے، چالیس روپے تنخواہ، ہوٹل کا مالک علی جو بڑھئی تھا جس نے یہ ہوٹل بڑی محنت سے جنگل سے لکڑی چرا چرا کر بنایا تھا۔ خود چور تھا۔ اسلئے اپنے ہوٹل کے منیجر کو بھی چور سمجھتا تھا۔ ہر روز بلا ناغہ فردوس کے حساب کتاب کی پڑتال کرتا۔ دودھ، مکھن اور شہد اپنے ہاتھ سے تقسیم کرتا، لیکن اس پر بھی اُسکی تسلی نہ ہوتی۔ مزید نگرانی کے لئے اُس نے ایک سکھ نوجوان کو بھی ملازم رکھ لیا اور اب پاکستان اور خالصتان ایک دوسرے کے قریب رہتے ہوئے ایک دوسرے سے خائف ہونے لگے، نگرانی سے ایمان میں خود بخود فرق پیدا ہونے لگا۔ سیدھی سادی باتوں میں فریب نظر آنے لگا۔ دل خود بخود بد دیانتی

کی طرف مائل ہونے لگا۔ ہر وقت، ہر طرف سے شکوک و شبہات کا طوفان اُمڈتا ہؤا دکھائی دینے لگا۔ آنکھوں کی خوبصورتی اور معصومیت زائل ہو گئی۔ اب آنکھیں کنکھیوں سے دیکھنے کی عادی ہو گئیں۔ دل اپنے غصّے کو اور اپنے دشمن کو قتل کر دینے کی جائز تمنا کو ایک جھوٹے غیر فطری تبسّم میں چھپانے لگا۔ ہوتے ہوتے یہ نگہداشت اس حد تک بڑھ گئی کہ منیجر اور مخبر سائے کی طرح ایک دوسرے کا پیچھا کرنے لگے اور ہوٹل کا سارا انتظام بڑے بیرے کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ ہندوستان کی تاریخ فردوس میں بھی اپنے آپ کو دُہرا رہی تھی۔

بڑا بیرہ ہر وقت مسکراتا رہتا تھا۔ خاص کر بخشش کے وقت تو اُس کی عجیب حالت ہوتی تھی۔ اُس وقت مجھے وہ وزن ماپنے والی جھری دار مشین یاد آتی ۔ ادھر جھری میں ایک آنہ ڈالا۔ دوسرے لمحے میں کھٹ سے ٹکٹ برآمد۔ جس پر وزن لکھا ہوتا تھا۔ بس یہی حالت بڑے بیرے کی تھی۔ اُدھر آپنے بخشش اُس کے ہات میں تھمائی۔ اور کھٹ سے بتیسی حاضر۔ مجھے اس مسکراہٹ سے ایک گونہ عشق ہو گیا تھا اور میں بخشش کے اِس مشینی تأثر کو دیکھنے کے لئے بیرے کو اکثر ٹپ کیا کرتا۔ واللہ کس سرعت سے وہ بتیسی

کھلتی تھی۔ بجلی کی سی تیزی سے، وہ وزن ماپنے والی مشین بھی تو اتنی جلدی کام نہ کرتی تھی۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں مشین آدمی سے زیادہ تیز رفتار ہے انہیں فردوس کے بڑے بیرے کو دیکھنا چاہیئے۔

فردوس کے بڑے بہشتی کا نام عبداللہ تھا۔ عبداللہ ایک اُجڈ کشمیری کسان تھا۔ بدصورت، بے ڈھنگی چال۔ آنکھوں کے گرد بڑے بڑے حلقے، سرخ رخساروں پر نیلی وریدیں باہر اُبھری ہوئیں۔ سامنے کے دانت غائب، عمر بھی کوئی ساٹھ سال سے اوپر ہی ہوگی، عبداللہ کا ایک لڑکا تھا باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم سا معلوم ہوتا تھا۔ عمر گیارہ بارہ برس، ہات پاؤں سخت میلے، گھٹنوں تک اُونچا پائجامہ۔ قمیص کی باہیں پھٹی ہوئیں۔ ہاں آنکھیں کنول کی طرح روشن تھیں۔ بڑی بڑی آنکھیں اور معصوم چہرہ۔ بال بڑھے ہوئے اور پریشان، اور گردن پر میل کی تہیں۔ اک معصوم روح جو غریبی کے کیچڑ میں دھنسی ہوئی تھی اور باہر نہ نکل سکتی تھی اور مدد کے لئے چلا رہی تھی۔ اسے سب لوگ چھوٹا بہشتی کہتے تھے۔ عبداللہ اپنے بیٹے کو پیار سے غریب کہا کرتا تھا۔ عجیب نام ہے۔ غریب۔ یہ نام سن کر میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ غریبی دنیا کا سب سے بڑا گناہ ہے۔ اور دنیا کے

کسی باپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے بیٹے کو غریب کہے، لیکن شاید عبداللہ ایک حقیقت بیان کر رہا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو "میرا راجہ بیٹا" کہہ کر اپنے آپ کو اور دنیا کو دھوکا نہ دینا چاہتا تھا۔

ہوٹل میں ایک اور بہشتی بھی تھا۔ یوسف۔ شکل سے کنجڑا دکھائی دیتا تھا۔ بڑا بد دماغ بہشتی تھا۔ ہر روز پٹتا پھر بھی گالی کے بغیر کام نہ کرتا۔ اس کے علاوہ وہ چرس کا دم بھی لگاتا تھا۔ اور عورتوں کی دلالی بھی کرتا تھا۔ یوسف چھوٹے بیرے کا بڑا دوست تھا۔ چھوٹا بیرہ ایک عجیب قسم کا انسان تھا۔ بیحد خدمت گذار "جی ہاں" کے سوائے اُس کے منہ سے کبھی کوئی اور کلمہ نہیں سنا۔ لب و لہجے میں روغن قاز اس قدر گھُلا ہوا تھا۔ کہ آدمی کے بجائے بناسپتی گھی کا ڈبہ معلوم ہوتا تھا۔ اس قدر بھی خوشامد کیا۔ کہ ہر وقت ہاتھ جوڑ رہے ہیں۔ مرے جا رہے ہیں۔ گفتار و اطوار میں اس قدر تملق اور چاپلوسی پیدا کر رہے ہیں جو ہر شریف انسان کے لئے بے حد شرمناک ہے۔ میں نے ایسا نرم گفتار، خوشامدی پُر فن انسان اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ یہ بھی عورتوں کا دلال تھا۔ لیکن صرف انگریز عورتوں یا اینگلو انڈین چھوکریوں کی دلالی کرتا تھا۔ کبھی کبھار کسی ہندوستانی فلم ایکٹرس کا کام بھی کر دیتا۔ اُس کا

نام تھا۔ کیا نام تھا۔ بھلا سا نام تھا۔ ذہن میں پھر رہا ہے۔ زبان پر نہیں آرہا۔ ہاں۔ زمان خاں، زمان خان! یہ نام میں اس لئے لکھ رہا ہوں۔ کہ ممکن ہے تمہارے دل میں کبھی اس قسم کی خواہش پھر جاگ اُٹھے، اور تم فردوس میں جا اُترو۔ ہاں تو زمان خاں کا نام نہ بھولنا۔ ایک ہی حرامی ہے اس فردوس میں۔

اِس جہاز نما ہوٹل کا حدود اربعہ نامکمل رہ جائیگا۔ اگر میں یہاں کے ایک مستقل باشندے کا ذکر نہ کردوں۔ یہ ایک آرٹسٹ بڈھا تھا۔ اور پچھلے دس سال سے گلمرگ میں اسی ہوٹل میں مقیم تھا۔ ملگجی داڑھی، آئین سٹائن کا سا سر، وہی الجھے ہوئے بال وہی فراخ ماتھا۔ ہاں ہونٹوں اور ناک کی تراش یہودیوں کی سی نہ تھی، ناک کے دائیں نتھنے پر ایک چھوٹا سا مسا تھا، جو اُس کے چہرے کی فراست کو اور بھی نمایاں کر دیتا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے رنگ کا میں کبھی ٹھیک طور سے اندازہ نہ کر سکا کبھی تو وہ آسمان کی پہنائیوں کی طرح نیلی معلوم ہوتیں، اور کبھی کسی پُرانی ٹھہری ہوئی جھیل کی گہرائیوں کی طرح سبز دکھائی دینے لگتیں، اور پھر اُس کے چہرے پر کسی نامعلوم سے دھند لکے کا غبار ہر وقت چھایا رہتا۔ اُس لطیف دھند کی طرح ہلکا سا جو اکثر میرے کمرے میں گلمرگ کے بادلوں سے چھٹ کر بھاگتی ہوئی آجایا کرتی۔ اور برائن کا چہرہ

(بڈھے کو سبھی او برائن کہتے ہیں) کبھی تو اُس غبار میں بالکل روپوش ہو جاتا، اور کبھی یہ غبار اِس قدر لطیف ہو جاتا، کہ اُس کے دھندلے خدوخال کے نیچے اُس کی زندگی کا استہزائیہ انداز صاف صاف عیاں ہو جاتا، او برائن خوب پیتا تھا، اور ہمیشہ بڑھیا شراب پیتا تھا، اور جب مخمور ہوتا تو بہت عمدہ باتیں کرتا تھا۔ شگفتہ انداز سلجھے ہوئے فلسفیانہ فقرے، طنزیہ بیان جن میں ایک انفرادی تجربے کی ساری گہرائی پنہاں ہوتی، وہ کبھی تو گھنٹوں باتیں کرتا اور کبھی گھنٹوں چپ رہتا۔ اُسے نہ شکار کا شوق تھا نہ عورتوں کا، اور عجیب بات یہ ہے کہ گوشت بھی نہ کھاتا تھا۔ ہاں پنیر سے اُسے بہت رغبت تھی۔ کہتا تھا کہ پنیر کے ایک ٹکڑے پر میں دس دن زندہ رہ سکتا ہوں، تم ابھی بچے ہو، جب میری عمر کو پہنچو گے تو معلوم ہوگا کہ عورت کے شباب میں بھی وہ تازگی نہیں ہے جو اس پنیر کے ٹکڑے میں اور اِس بادۂ ناب کے ایک قطرے میں، پیو، پیو اور پیو، اور اس گلمرگ کی شفق کو دیکھو، جس کے اُبلتے ہوئے خون میں اس وقت مغربی اُفق کا حسن دوچند ہو گیا ہے،.... او برائن فردوس کا فلسفی ہے۔ اگر کبھی گلمرگ جاؤ تو اِس سے ضرور ملنا، وہ زندگی کے اُن حقائق کو بیان کرتا ہے جنہیں

اُس نے اپنی حیات کے زخموں سے نچوڑا ہے، اُس کا بیان ایک تلخاب ہے، اِک رِستا ہوا زخم ہے، اِک خوفناک زہر کا دھارا ہے، لیکن اس زہراب کی لہروں پر اِک ایسے ہلاکت آفریں تبسم کا سایہ ہے کہ تم اُس سے مسحور ہوئے بغیر نہ رہ سکو گے۔۔۔۔اور اگر سچ پوچھو تو ابھی تک زندگی میں اس کے سوا اور ہے بھی کیا؟۔۔۔۔۔

عبداللہ کے بیٹے کو لکھنے پڑھنے کا بہت شوق تھا، وہ اُردو کا قاعدہ ختم کر چکا تھا، اور اب اُردو کی پہلی کتاب پڑھ رہا تھا جس کے پہلے صفحے پر اُس کا باپ حقہ پی رہا ہے، عبداللہ کو جب بھی فرصت ملتی، وہ اپنی کوٹھڑی میں جا کر حقہ پیتا، یا کبھی کبھار جب مجھے فرصت ملتی تو بالکونی میں آن بیٹھتا، اُس کا بیٹا مجھ سے سبق لیا کرتا، اور عبداللہ اپنی زندگی کی رام کہانی سناتا، یہ کہانی اُس نے ٹکڑوں میں، تماشوں میں، آنسوؤں اور مسکراہٹوں کے درمیان، نہانے کے ٹب کے پاس کھڑے ہو کر، کھانستے ہوئے، دمے کے عارضے سے جنگ کرتے ہوئے سنائی تھی، یہ کوئی بڑی رومانی داستان نہ تھی، کوئی بڑی المناک داستان نہ تھی، ایک سیدھے سادے دہقان کی زندگی تھی، چند خوشیاں تھیں، اور ان گنت آنسو۔ وہ ایک کسان تھا، چند بیگھے زمین تھی،

جوانی میں اُس نے محبت بھی کی تھی، شادی بھی کی، چند سال بہت بھلے معلوم ہوئے، زندگی کا رقص سہانا تھا۔ صعوبتیں آئیں، لیکن شباب کے تازے خون نے انہیں دھو دیا، ماں باپ کے مرنے کے بعد اُس نے گاؤں کے مہاجن کا قرضہ چکایا۔ اور کھیتوں کی پیداوار بڑھانے کے لئے مختلف طریقے سوچنے لگا، اپنے کھیتوں کا ایک حصّہ اُس نے پھلدار درختوں کی کاشت کے لئے الگ کر دیا، دل میں اُمنگیں تھیں، چاہتا تھا کہ وہ معمولی کسان نہ رہے، دیہات کا ایک متموّل زمیندار بن جائے، امارت حاصل کرنے کے لئے اُس نے مہاجن سے قرضہ لیا، لیکن متواتر دو سال برف و باراں کا یہ عالم رہا کہ باغ پنپ نہ سکا، پھر قحط پڑا، زمین بک گئی، بڑا لڑکا مر گیا، بیوی بھی اسی قحط کی نذر ہوئی، وہ اپنے چھوٹے اور آخری بچے کو اپنی چھاتی سے لگائے دیس بدیس گھوما، رخساروں کا رنگ اُڑ گیا، آنکھوں کی چمک غائب ہو گئی دکانوں پر کوئلہ اٹھاتے اٹھاتے دمے کی بیماری ہو گئی، اب کھانسی ہوتی ہے گلے میں بلغم پھنس جاتا ہے، گلا اندھ جاتا ہے، آنکھیں پھٹی پڑتی ہیں، پانچ چھ سال اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد اپنے وطن واپس آیا، کیونکہ وطن کی مٹی ہر بھٹکی ہوئی روح کو ہر وقت واپس بلاتی رہتی ہے، اب چھ سال سے وہ اسی

ہوٹل میں نوکر ہے، غنیمت ہے یہ زندگی، اللہ کا شکر ہے صاحب، دو وقت روٹی مل جاتی ہے، صاحب انعام بھی دیتے ہیں، یہ میرا یتیم بچہ ہے، غریب۔ خدا اس کی عمر دراز کرے، یہاں اسی طرح پڑا رہے گا، تو بہشتی کے سوا اور کیا بن سکے گا۔ دو چار حرف پڑھ جائے گا۔ تو زندگی سنور جائیگی۔ خدا آپ کو اس کا اجر دے۔ میرے غریب کو سبق بتا دیجئے، اچھا میں اب چلتا ہوں، ولیم صاحب کے نہانے کے لئے پانی رکھ آؤں۔

اُفوہ کس قدر بے حیا ہے یہ خدائی، کیسی معمولی سی زندگی ہے، اب کن توقعات پر آدمی جیئے، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں آدمیوں کی یہی زندگی ہے ہر ملک میں ہر قوم میں، کرۂ ارض کے ہر حصے میں، چند ایک افراد اور جماعتوں کو چھوڑ کر ہم سب کو اپنی تہذیب پر، اپنے مذہب پر، اپنی کلچر پر، اپنی سوجھ بوجھ پر، اپنی فراست پر ناز ہے، یہ ہیکڑی، یہ رعب، یہ ملمع سازی!..... انسان کے جھوٹ اور خود فریبی کی کوئی حد نہیں ہے، اور عبداللہ کو دیکھئے کہ ناخوش ہے، کھانس رہا ہے، پھر بھی جیئے جا رہا ہے، اس امید پر کہ اگر دنیا نے اُسے پنپنے کا موقع نہیں دیا، اگر سماج کے قہر نے اُس کی زندگی کی ساری راحتوں اور مسرتوں کو اُس کی آنکھوں کے سامنے گلا گھونٹ کر، اُسے یوں

ترسا ترسا کر مار ڈالا۔ تو اب یہی سماج، یہی دُنیا، یہی نظامِ حیات، اُس کے بیٹے کو پنپنے کا موقع دیگا، لیکن عبداللہ آخر انسان ہے، کشمکشِ حیات اُس کی گھٹی میں ہے، لڑے جاتا ہے۔ شاباش بیٹا، لڑے جا، مرے جا، ایک دن تیرا بیٹا جوان ہوگا، اُس کی لہکتی ہوئی اُمنگوں کی کامرانی میں تو پھر زندۂ جاوید ہوگا، اُس کے شباب کی تازگی میں اُس کے حسن و عشق کی رنگین داستانوں میں، اُس کے جذبۂ مسرت کی سربلندیوں میں تری روح اپنے آپ کو پالے گی۔

بالکونی کے ملاقاتیوں میں سے ایک خوش شکل جوڑے کی یاد اب بھی دل میں باقی ہے، دونوں نوجوان تھے، خوبصورت اور پڑھے لکھے، نئی نئی شادی ہوئی تھی، اسی لئے گلمرگ میں ہنی مون منانے آئے تھے، اسی لئے گلمرگ دیکھنے کے بجائے ایک دوسرے کو دیکھنے میں زیادہ مصروف رہتے تھے، لڑکا لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا، جانِ من یہ شفق کس قدر خوبصورت ہے، اور لڑکی اپنا نرم ہات اُس کے کندھے سے چھوکر کہتی، "اور یہ پھولوں سے مہکی ہوئی فضا، ہائے میں تو مر جاؤں گی"......

بس یہ دونوں دن بھر مرتے رہتے تھے............. ، شفق پر مر

رہے ہیں، پھولوں پر مر رہے ہیں، گاف کورس پر مر رہے ہیں، چاندنی پر مر رہے ہیں، دیودار کے درختوں سے لیکر پہاڑی ٹٹوؤں پر مر رہے ہیں، بعد میں یہ بھی معلوم ہوا، کہ یہ دونوں دن بھر تو مرتے رہتے ہیں اور رات بھر جاگتے رہتے ہیں، اتفاق سے اُن کا کمرہ میرے کمرے کی چھت پر تھا، تیسری منزل پر، بس رات کو کبھی گلاس ٹوٹنے کی آواز آتی تھی، کبھی چارپائی اوندھی ہو جاتی، کبھی بلیاں غراتی تھیں، اور برائن کا خیال تھا کہ دونوں ایک خواب دیکھ رہے ہیں اور نہیں جانتے کہ اس الف لیلوی خواب کی حد پر حقیقت کا آسیب بھی رہتا ہے۔"

میں نے کہا، "بڈھے تیری عقل ماری گئی ہے۔ کیا شادی کرنا بُرا ہے، شادی ہوتی ہے، بچے پیدا ہوتے ہیں، اِس خواب سے انسانوں کی سہانی بستی میں ایک نئے گھر کا اضافہ ہوتا ہے۔

اور برائن کہتا، "شادی بُری نہیں، خواب کا ٹوٹنا بُرا ہوتا ہے، اور یہ سپنے بہت جلد ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ قدرت اپنے دام بچھاتی ہے، اِسی لئے تو اُس نے پھولوں میں خوشبو، ہرن میں کستوری، اور عورتوں میں رعنائی رکھی، اور جب قدرت کا مقصد پورا ہو جاتا ہے، تو پھول مرجھا

جاتے ہیں، ہرن شکار ہو جاتے ہیں، عورتیں بوڑھی ہو جاتی ہیں، اور تمہارے سپنے ٹوٹ جاتے ہیں۔"

"جس طرح رات کو مرے ہاتھ سے شیشے کا گلاس ٹوٹ گیا تھا؟" لڑکی نے مسکرا کر کہا، اور کنکھیوں سے اپنے محبوب کو دیکھنے لگی۔ دونوں نے کسی ایسے دلچسپ واقعے کو اپنی نگاہوں میں دہرایا، جس کی حیثیت اس وقت قند مکرر کی سی ہو گئی تھی،

میں نے پوچھا" پھر کیا ہوا؟"

وہ دونوں ہنسنے لگے، لڑکی بولی" رات کا وقت تھا، گلاس ٹوٹ گیا اور پانی فرش پر بہ نکلا۔ فرش لکڑی کا تھا اور نیچے آپ کا کمرہ تھا۔"

میں نے کہا: "وہ تو یوں سمجھئے۔ خیریت ہوئی، میرا بستر ذرا ایک طرف تھا..... ہاں کمرے کی دری ابھی تک گیلی ہے۔"

"آہ! ڈارلنگ، دیکھو وہ چڑیا کتنی خوشرنگ ہے" لڑکی نے مجھے ٹوٹے ہوئے گلاس کی طرح بے کار سمجھ کر اپنے شوہر سے کہا۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ دباتے ہوئے بالکونی سے باہر دیکھنے لگے۔

او برائن بولا" حسن ابدی نہیں ہے، بس مجھے کائنات اور اس کے

بنانے والے پر رہ رہ کر بھی غصہ آتا ہے، آخر ایسا کیوں ہے"۔

میں نے کہا "کون کہتا ہے ابدی نہیں ہے، تم حسن کو انفرادی حیثیت سے دیکھتے ہو، سخت رجعت پسند ہو تم۔ حسن کو اجتماعی حیثیت سے دیکھو، پھول ہمیشہ مسکراتے ہیں، نافے میں کستوری سدا مہکتی ہے، عورتوں کی رعنائی...

..." میں نے نوجوان لڑکی کی طرف دیکھ کر فقرہ نا تمام رہنے دیا۔ اوبرائن کی آنکھیں گہری سبز ہو گئیں۔

"اور پھر غور کرو۔ کہ حسن وقت کا ایک حصّہ ہے۔ اُس کا جمالیاتی تاثر ہے جب تک وقت نہیں مرتا حسن کیسے مر سکتا ہے، عورت اپنی لڑکی میں، پھول اپنی کلی میں، ہرن اپنے نافے میں اُس حسن کو فروزاں دیکھتا ہے"۔

"اور عبداللہ اپنے بیٹے میں" اوبرائن نے طنز سے کہا۔

ہم بہت عرصہ چپ رہے، لڑکا اور لڑکی چلے گئے، پھر بھی خاموشی رہی، بیرے نے چائے رکھ دی، ہم دونوں خاموشی سے اُسے پینے لگے۔ پہاڑوں پر دھند گہری ہو گئی تھی، گالف کورس پر بدلیوں کے نازک نازک ہات بڑھتے ہوئے نظر آئے، بالکونی تک آپہونچے، ہمارے گالوں کو چھونے لگے، یہ نازک نازک ہات ....

بس گلمرگ میں مجھے یہی چیز پسند ہے، یہ لطیف لمس، یہ دھند کی سپید انگلیاں، اپنے گاؤں کا سا منظر ہے' اوبرائن اپنی پرانی یادوں میں کھو گیا۔

پھر یکایک کہنے لگا۔ شراب کبھی بوڑھی نہیں ہوتی، بس یہی ایک چیز دنیا میں ابدی ہے'..... میں نے اک عورت سے محبت کی، اس نے مجھے ٹھکرا دیا، میں نے اپنی محبت کے نشے کو مدتوں تازہ رکھا۔ پھر یہ محبت بھی بوڑھی ہو گئی، میں نے اُسے جوان رکھنا چاہا، لیکن ہر لمحے اس کے چہرے پر جھریاں پڑتی گئیں، ایک دن وہ بھی مر گئی۔

"اور۔ وہ عورت"

"پتہ نہیں کہیں ہو گی، میں اب اُسے دیکھنا نہیں چاہتا، میں اپنے وطن واپس جانا نہیں چاہتا۔ بیس سال پہلے میں نے اُسے دیکھا تھا۔ وہ پیانو پر بیٹھی ہوئی اک دلفریب گت بجا رہی تھی۔ اوبرائن آہستہ آہستہ سیٹی میں وہ گت بجانے لگا، اُس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ باہر دھند میں وہ لڑکا اور لڑکی غائب ہو رہے تھے۔

فردوس کا عشق بڑا عجیب ہے' فردوس میں ہر اتوار کو ٹنگ مرگ سے نرسیں آتی تھیں' اور آیا لوگ اور ناشتہ کھلانے والی لڑکیوں کو ہر بدھوار کو

چھٹی ملتی تھی۔ اسلئے فردوس میں بدھ اور اتوار کی رات کو کھانے اور پینے کے لئے خاص اہتمام ہوتا، اوّل تو کھانا زیادہ تیار کیا جاتا، شراب زیادہ مقدار میں مہیا کی جاتی، اور پھر اُسی دن گورے اور امریکن فوجی بھی نجانے کہاں سے ٹپک پڑتے، بالکل بچّوں کے سے چہرے، ظاہری خشونت کے باوجود بھی مجھے وہ بے حد معصوم دکھائی دیتے، پتلونوں کی تراش، ٹوپی کے زاویے، اور چھاتی کے پھیلاؤ کے باوجود یہ لوگ مجھے بُرے نہ لگتے، اُن کے چہرے جیسے کچھ مانگ رہے تھے، جیسے کسی چیز کے متلاشی تھے، بھوکے تھے، پیاسے تھے، کچھ حاصل کرنا چاہتے تھے۔

یہ عشق حاصل کرنا چاہتے تھے، چنانچہ ان کی ضرورت زمان خان جو فردوس میں عشق کا تاجر تھا۔ پوری کر دیتا۔ انداز یہ ہوتا۔

"ڈیل بیرا"

"یس سر"

"کیا بات ہے"

"سب ٹھیک ہے، ٹنگ مرگ سے نیا مس صاحب آیا ہے۔ لیکن صاحب اُس کو صبح چار بجے ٹنگ مرگ میں میجر صاحب کے بنگلے پر حاضر ہونا مانگتا۔۔"

"اوہ سب ٹھیک ہے، ام کھود۔ سُنا تم نے، ام کھود پہنچا یئگا"

ایک انداز یہ ہوتا۔

"ہیلو ڈارلنگ!" وہ کہتا۔

"ہیلو سوائن" (سؤر کے بچے) نرس کہتی۔

"کم آن"

"یو سٹُوپڈ" (تم احمق ہو!)

"ڈونٹ بی سِلّی (جاہل نہ بنو) کم آن" (اب آبھی جاؤ)

"You are Very Cheeky"

"Shut up"

اِس خوبصورت اور حسین تعارف کے بعد دونوں دیلودار کے جنگلوں میں بنفشے کے پھُول جمع کرنے کے لئے تشریف لے جاتے۔

اور برائن ان فاقہ مستوں کو معاف کر دیتا تھا۔ یہ بیچارے چند دنوں کے لئے چھٹی پر آئے تھے۔ اس کے بعد پھر جنگ پر چلے جائیں گے، یہ فوجی ان چند دنوں میں اپنی جوانی سے سارا رس نچوڑ لینا چاہتے تھے۔ اپنی خالی آغوش کو حسن کی سارے گداز سے بھر لینا چاہتے تھے، اپنے ارمانوں

کی دنیا کو بوسوں کی شہد آگیں لذت سے ہمکنار کر دینا چاہتے تھے۔ پھر اس کے بعد وہی ریتیلے میدان ہوں گے، وہی خندقیں، جنگلوں میں دشمنوں کی گھات۔

میں سپاہی کو ہمیشہ معاف کر دیتا ہوں، وہ ایک عورت کی عصمت پر ہاتھ ڈالتا ہے۔ تو ہزاروں عورتوں کی عصمت بچا لیتا ہے۔" اوبرائن کا یہ فقرہ مجھے اب تک یاد ہے۔ شاید اُس وقت برما سے بھاگتے ہوئے ایک ٹھیکیدار نے کہا تھا۔ صاحب کس کی عصمت وصمت یہ فلسفہ کھانا کھانے کے بعد سوجھتا ہے۔ اجی صاحب جب ہم برما سے بھاگے تو میرے ساتھ پورا خاندان تھا۔ بیوی تھی، نوجوان لڑکیاں تھیں، چھوٹے چھوٹے بچے تھے، سب راستے میں مر گئے، میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے بچوں کو، اپنی بیوی کو روٹی کے ایک ٹکڑے کے لئے ترستے دیکھا۔ میری لڑکیاں پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے اپنی عصمت اُس خونی سڑک پر بیچتی نظر آتی تھیں، عصمت؟ اُلو کا پٹھا ہے۔ حرامزادہ ہے وہ جو عصمت کی تقدیس پر ایمان رکھتا ہے۔ یہ سب فلسفہ پیٹ بھرنے کے بعد سوجھتا ہے......

وہ دیر تک اسی طرح بکتا جھکتا رہا۔ اوبرائن کے چہرے سے غبار چھٹنے لگا۔ کہنے لگا۔ شراب منگاؤ، شراب، بس شراب کبھی بوڑھی نہیں ہوتی، ثمر آ

کبھی نامہرباں نہیں ہوتی، شراب کبھی دھوکا نہیں دیتی، وہ انسان کی طرح ظالم نہیں ہے، خدا کی قسم۔ ابنِ مریم کی قسم وہ ہرگز ہرگز ظالم نہیں ہے۔

گہرے نیلے آسمان میں تارے چمکنے لگے، نیڈوز ہوٹل کی پہاڑی پر یکایک بجلی کے قمقموں کی قطار روشن ہو اُٹھی۔ ایسا معلوم ہؤا گویا کسی نے بنفشے کے پھولوں کی چھڑی فضا میں اُچھال دی اور پھر چاند مغربی اُفق پہ شفق کی آخری لکیر پہ محجوب، شرمایا ہؤا برآمد ہؤا، اُس مہ وش ساقی کی طرح جس نے اپنے دستِ سیمیں میں پہلی بار مینا اُٹھائی ہو۔

او برائن پینے لگا۔ اب اُس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ آسمان کی طرح صاف

کمرہ نمبر سات میں ایک اطالوی بڈھا اور اسکی لڑکی میریا رہتے تھے میریا دن بھر اپنے کمرے میں پیانو بجاتی رہتی، اور شام کو اپنے باپ کے ہمراہ سیر کرنے جایا کرتی۔ میریا کے خدوخال میں ایک ایشیائی مناسبت تھی۔ شاید اسی لئے میں اُسے اس قدر پسند کرتا تھا۔ بڈھا اطالوی یہاں پچیس تیس سال سے رہتا تھا۔ بازار میں اُس کی ایک دکان تھی۔ جہاں وہ سامان خورونوش رکھتا تھا۔ کتابوں کی ایک چھوٹی سی لائبریری بھی تھی،

جس میں زیادہ تر جاسوسی ناول، فحش قصے، بھوتوں کی کہانیاں اور اسی قسم کا ادب تھا، جو سپاہیوں کو اور پڑھے لکھے امرا کو بیحد مرغوب ہے، وہ اُس کی لائبریری میں سے کتابیں کرائے پر پڑھنے کے لیئے لے جاتے، بڈھے اطالوی کو چھڑی بنانے کا بہت شوق تھا۔ اور وہ جنگل کی لکڑیوں سے ایسی خوبصورت چھڑیاں بناتا تھا جو گل مرگ کی سوغات میں شمار ہوتی تھیں اور سیّاح انہیں خرید کر بڑے شوق سے اپنے وطن لے جاتے تھے، اس کے علاوہ اُسے "Concertina" بجانے کا بہت شوق تھا۔ رات کو وہ کھانا کھا کر Concertina کے ساتھ گایا کرتا اور میریا پیانو بجاتی۔ میریا پیانو بہت اچھا بجاتی تھی۔ اور جنگ سے پہلے گلمرگ میں اکثر معزز انگریزی خاندانوں میں پیانو سکھانے جایا کرتی۔ جنگ شروع ہوتے ہی یہ دونوں باپ بیٹی حراست میں لے لیئے گئے۔ بعد میں جب انہوں نے اپنے ہندوستانی باشندے ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا تو چھوڑ دیئے گئے، پھر بھی ان پہ کڑی نگرانی تھی، جنگ سے پہلے بڈھے کی دکان کا نام اطالوی سٹور تھا، جنگ شروع ہوتے ہی اُس نے یہ نام بدل کر "اینٹی اطالوی سٹور" کر دیا، حراست کے بعد اس سٹور کا نام "اتحادی سٹور"

ہوگیا، دراصل اس بڈھے کو سیاست سے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ میرا خیال ہے کہ اگر کل گل مرگ پر جنگل کے ریچھوں کی حکومت ہو جائے، تو بھی اطالوی بڈھا اپنی دکان کا نام بدل کر "ریچھ سٹور" رکھ دیگا، اور ساتھ ہی جلی حروف میں یہ "یہاں پر ریچھوں کو شہد مفت ملتا ہے!" لیکن فی الحال تو اس حکومت کے قیام کا کوئی گمان نہ تھا۔ جنگ شروع ہو جانے کے بعد میریا کا انگریزی خاندانوں میں آنا جانا بند ہو گیا تھا۔ اور پیانو سکھانے سے جو آمدنی ہوتی تھی۔ وہ بھی ختم ہو چکی تھی۔ اُدھر اطالوی یعنی اینٹی اطالوی یعنی اتحادی سٹور کی آمدنی بھی کم ہو گئی تھی۔ اس لئے حالت ذرا پتلی تھی، فردوس کے چھوٹے بیرے زمان خان نے یہ سب حالات دیکھ کر میریا پر اپنا دام پھینکا تھا۔ لیکن میریا قابو میں نہ آئی، بعض غریب لوگ بیحد ڈھیٹ ہوتے ہیں، بڑی مشکل سے قابو میں آتے ہیں۔ میریا کا شمار انہی بڑی مشکلوں میں ہوتا تھا۔ زمان خان اُسکی وجہ سے بیحد پریشان تھا، ہوٹل کے بڑے بہشتی عبداللہ کو اسی وجہ سے میریا اور اس کے باپ سے ہمدردی تھی۔ کیونکہ وہ خود اک لٹا ہوا کسان تھا۔ سینے میں اک زخمی دل رکھتا تھا۔ اسی وجہ سے اُس کی لڑائی زمان خان اور چھوٹے بہشتی سے ہوئی، جو کمرہ نمبر سات کا کام دلجمعی سے نہ کرتے تھے اور

زمان خان تو کمرہ نمبر سات کا کام کرنے کے بجائے لڑکی کو اُلٹا پریشان کرتا تھا، عبداللہ اس لڑائی میں بُری طرح پٹا گیا، ہات پاؤں پر چوٹیں بھی آئیں اور منیجر نے الگ ڈانٹا، کیونکہ کمرہ نمبر سات کی دیکھ بھال زمان خاں اور یوسف کے سپرد تھی، عبداللہ کو دخل در معقولات کا کیا حق تھا۔ اب کے اُس نے اپنی ہمدردی یوں ظاہر کی تو نوکری سے الگ کر دیا جائے گا۔

میریا مجھے پسند تھی۔ اُس کا حسنِ ملیح، کنول کی طرح کھلا ہوا چہرہ۔ آنکھوں کی خطرناک معصومیت، جسم کے نازک خم، ہونٹوں کا وہ اجلا اجلا تبسم، لیکن میریا کی متانت مجھے بہت ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ میں چاہتا تھا۔ کہ یہ لڑکی متین نہ رہے، ان معصوم آنکھوں میں شوخی جھلکنے لگے، اس کنول کی پنکھڑیوں پر ہنسی کی تیزی رقصاں ہو جائے، اس اُجلے تبسم میں شرارت کی بجلی تڑپ جائے، اُس کے سارے رگ وپے میں اک ایسی تھرتھری آئے، کہ اُس کی ہستی کا گوشہ گوشہ بیدار ہو جائے، اور اُس کی حیات کا بہاؤ کسی طوفانی ندی کی طرح اُمڈتا ہوا نظر آئے.....

......میریا.....میریا..... ایک دن پیانو پر Nutcrackers کی دھن بجا رہی تھی، مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے کہا۔ یا تو تم نری احمق ہو،

بے وقوف ہو، جاہل ہو-یا۔۔۔۔"

"یا؟۔۔۔۔ہاں کہو۔"

"یا تم عورت کے بھیس میں راسپوٹین ہو؟ Nut Cracker کی دُھن سن کر مجھ ایسے کورمغز ایشیائی کا جی بھی ناچنے کو چاہتا ہے، اور ایک تم ہو کہ بجھے ہوئے بلب کی طرح بالکل ٹھس بیٹھی ہو-کیا بات ہے آخر؟ اُٹھو بھاگو، دوڑو، ناچو، ناچو، ناچو حتےٰ کہ تمہاری کائنات کا ذرّہ ذرّہ متحرک ہو جائے، اور تمہارے جسم کا ایک ایک خم تھک کر چوُر ہو جائے" یہ کہہ کر میں نے اُسے بازوؤں سے پکڑ کر پیانو پر سے اٹھالیا۔ اور دو تین چکر کمرے میں تیزی سے ناچتے ہوئے لگائے، پھر یکایک ٹھہر گیا، اب وہ میرے بازوؤں کے حلقے میں تھی۔ میں نے اُس کے ہونٹ چومتے ہوئے کہا۔"اِس جنگ کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے!"

اُس نے اپنے آپ کو میرے بازوؤں کی گرفت سے آزاد کر لیا، اور میرے منہ پر ایک ہلکا سا طمانچہ مار کر بولی۔"تم بڑے وحشی ہو جی"

میں نے کہا۔"میں یہی غصہ دیکھنا چاہتا تھا- مجھے تمہاری اس ہتین مسکراہٹ سے سخت چڑ ہے، تمہارے انداز اطالوی لڑکیوں ایسے نہیں ہیں،

وہ مجنونانہ جوش و خروش، وہ بے موقع ہنسی، اچھل کود۔ وہ ——— وہ سب کچھ تم میں نہیں ہے، واللہ تم عورت نہیں ہو، مرمر کا بُت ہو اور یا تو تم اپنی زلسیت پر دانستہ اس بھاری متانت کا دبیز پردہ ڈالے ہوئے ہو، تاکہ لوگ تم سے مرعوب ہو جائیں۔ یُو را سپوئیلڈ گرل.... ادھر آؤ۔ میرے پاس بیٹھو۔"

وہ کہنے لگی "جب تم میری عمر کو پہنچو گے۔ تو تمہیں معلوم ہوگا۔"

میں نے کہا "میں تم سے عمر میں دس سال بڑا ہوں۔"

میریا بولی۔ "میری مراد ذہنی عمر سے تھی۔ اصل عمر وہی ہوتی ہے۔ یوں تو شاید تم مجھ سے عمر میں دس سال بڑے ہو گے۔ لیکن تمہارا ذہن، تمہارا فہم، تمہارا ادراک بالکل مرغی کے ایک چھوٹے چوزے کی طرح ہے۔"

"اچھا تو گویا میں ایک چوزہ ہوں"۔ میں نے غصے سے اس کی کمر میں ہات ڈالتے ہوئے کہا۔

"ایک ناپختہ چوزہ!" یہ کہہ کر وہ مسکرائی، وہی متین، غم آلود مسکراہٹ۔

میں نے پوچھا "اس جنگ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

وہ کہنے لگی "جنگ.... جنگ.... تمہارا بوسہ بہت اچھا تھا.... جنگ بہت بری شے ہے۔ میں ایک عورت ہوں، میں آدمی کے بوسے کو سمجھ

سکتی ہوں، اس کے قاتلانہ جذبے کو نہیں سمجھ سکتی، یہ کشت وخون کیوں ہوتا ہے
میرا بھائی اس وقت فوجی قیدی ہے۔ اُس کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔
میں نے کہا، "معاف کرنا۔ یہ جنگ تمہارے فسطائیوں نے شروع کی ہے"
وہ بولی۔ "میں فسطائی نہیں ہوں۔ نہ ہی میرا بھائی فسطائی تھا میرا باپ
چھتریاں بناتا ہے۔ اور رات کو Concertina پر گانا پسند کرتا ہے،
مجھے پیانو سے عشق ہے۔ میں نے کبھی سیاست کے متعلق نہیں سوچا، ہمیشہ آزاد
اور لاتعلق سی رہی، اسی لئے مجھے فسطائیت پسند نہیں، جب میں پیدا ہوئی تو
عہدنامہ ورسائی پر دستخط ہو چکے تھے۔ اور میں ہندوستان میں تھی۔ مجھے مسولینی
سے کوئی ہمدردی نہیں۔ اُس نے تو میرا پیانو سکھانا بھی بند کر دیا۔"
اُس کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ میں نے کہا، "تم کسی پولیس آفیسر کے سامنے
بیان نہیں دے رہی ہو۔"
وہ بولی۔ "مجھ سے تو سبھی پولیس آفیسروں کا سا برتاؤ کرتے ہیں۔ میرے
لئے یہ نئی بات نہیں ہے، لیکن دراصل یہ ہماری غلطی تھی، ہم خوشی کے راگ
الاپتے رہے، Concertina بجاتے رہے، اور سیاست سے
بے بہرہ رہے، اور ہم نے فسطائیوں کو من مانی کارروائی کرنے کا موقع دیا۔"

......اُس کی سانس رُکنے لگی۔

میں نے اُس کی ٹھوڑی چھو کر کہا: "اچھا۔ چلو جانے دو...... یہ آخری جنگ نہیں ہے، اگر ہم لوگ پچیس تیس برس اور زندہ رہے، تو ایک اور جنگ دیکھیں گے اس سے کہیں بھیانک اور خوفناک جنگ، یہ جنگ فسطائیوں کو تو شاید تباہ کر دے۔ لیکن مشرق و مغرب کے نازک مسائل کو نہ سلجھا سکے گی۔ نہ یہ دنیا اُس اشتراکی نظام کی بنیاد رکھ سکے گی جس کے بغیر بھوک، بے کاری اور جہالت کا اِس کرۂ ارض سے دور ہونا ناممکن ہے۔ اسلئے آؤ، بے تھوون کا Moonlight Sonate شروع کرو۔ تاکہ اِس زندگی کی حرماں نصیبی اور اپنے محبوب آدرش کی دُوری کا احساس زائل ہو جائے......"

میریا نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور پیانو بجانے لگی۔

چاندنی رات تھی، میں اور راوبرائن کھانے کے بعد بالکونی میں بیٹھے ہوئے اپنے تخیل میں پرستانی قلعے تعمیر کر رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ البتھر کی جھیل کے وسط میں برف کے گلیشروں کے درمیان، ایک خوبصورت محل ہو۔ اور اس میں میریا ہو اور ایک بہت بڑا پیانو۔ چاندی کا اور میریا کا لباس سیب کے پھولوں کا ہو،.....اور میریا

ہو۔ اور میں — اور — بس اور کوئی نہیں..... اُتو کہیں کا۔ لوگ بھوک سے مر رہے ہیں۔ آٹا روپے کا دو سیر بک رہا ہے، اور جناب سوچ رہے ہیں۔ کہ اک چاندی کا پیانو، جھیل کے وسط میں ایک محل ہو، یہ ہو۔ وہ ہو..... بس ہمیشہ یہی مصیبت ہوتی ہے۔ ایسے خوبصورت سپنے اسی طرح جلد ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں لیکن آدمی ایسے خواب کیوں دیکھتا ہے، آدمی سے مراد کیا چیز ہے۔ عبداللہ بھی تو آدمی ہے، عبداللہ نے بھی کبھی ایسے خواب دیکھے تھے۔ اب بھی اپنے بیٹے کے لئے شب و روز ایسے ہی سپنے دیکھتا ہے، انسان کو یہ سپنوں کی دنیا کیوں پیاری ہے۔ اور کیوں وہ ان سپنوں کو حقیقت نہیں بنا لیتا، سورج، پانی، چاند، ہوا، کی طرح اگر زمین اور اس کی ساری پیداوار بھی سب انسانوں میں مشترک ہو جائے، تو ہر گھر ان سندر سپنوں کا جگمگاتا ہوا شیش محل بن جائے، پھر انسان ایسا کیوں نہیں کرتا۔ وہ کیوں غاصب ہے۔ اشتراکی کیوں نہیں، کیا اُس میں اتنی سی عقل بھی نہیں کہ اِس سیدھی سادی بات کو سمجھ لے.....

اوبرائن سگار کی راکھ جھاڑ کر بولا "ہنری فورڈ کا لڑکا مر گیا ہے"

میں نے پوچھا "پھر؟ اس سے موٹروں کے کاروبار پر کیا اثر پڑیگا، شہتوت کے درختوں پر پھل لگنے بند ہو جائیں گے کیا؟"

او برائن بولا۔ نہیں..... میں دراصل غور کر رہا تھا۔ کہ وہ ہنری فورڈ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ہنری فورڈ امریکہ میں سرمایہ داری کا مظہر ہے...... اب میں سوچتا ہوں۔ سرمایہ دار ہنری فورڈ خوش ہے؟ خوش تھا! خوش رہیگا؟ آخر یہ دولت کے انبار کیوں؟ ان کا مصرف ہی کیا ہے۔ جبکہ ہنری فورڈ دو بسکٹ اور آدھ پاؤ دودھ بھی دن میں ہضم نہیں کر سکتا"

میں نے کہا۔"ہنری فورڈ بہت بڑا آدمی ہے۔ وہ اس قدر محنت کرتا ہے کہ کچھ کھا نہیں سکتا"

او برائن بولا۔"مونٹ ایورسٹ بھی بہت بڑا پہاڑ ہے۔ بڑائی دونوں میں ہے۔ ہنری فورڈ میں اور مونٹ ایورسٹ میں بھی۔ لیکن ہنری فورڈ کی عظمت غیر فطری ہے مصنوعی ہے، اُس کی حیثیت غاصبانہ ہے، مونٹ ایورسٹ کی دلکشی اک معصوم بچے کی سی ہے جو سپید برف سے کھیل رہا ہو۔ وہ ابدی ہے"

میں نے پوچھا۔"گاندھی کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے"

او برائن بولا۔"ایک مدت تک مجھے کالے آدمیوں سے نفرت رہی اب بھی کبھی یہ نفرت جاگ اُٹھتی ہے۔ مجھے ان کا رنگ پسند نہیں ان کا احساس کمتری پسند نہیں، ان کا خوشامدانہ لہجہ پسند نہیں، میرا خیال رہا ہے کہ ان

ہیں بلی کی سی چالاکی اور لومڑی کی سی دھوکا بازی پائی جاتی ہے۔ اور حبشیوں کو تو ہیں مدتوں انسان سمجھنے سے انکار کرتا رہا۔ . . . گاندھی کالا آدمی ہے، وہ کبھی سفید آدمی کا دوست نہیں ہو سکتا، بعض لوگ اُسے یسوع مسیح کی طرح معصوم سمجھتے ہیں، میں اس دھوکے میں مبتلا نہیں ہوں۔ میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ وہ سفید نسل کے انسانوں کا جانی دشمن ہے۔

میں نے کہا " وہ تو صرف یہ چاہتا ہے۔ کہ ہندوستان میں ہندوستانیوں کی حکومت ہو"۔ اور براؤن بالکونی پر جھک گیا۔ بولا " ممکن ہے میرے جذبات عصبیت سے خالی نہ ہوں۔ آخر میں بھی سفید نسل سے تعلق رکھتا ہوں لیکن اس وقت اس نے ہمیں سخت مشکل میں ڈال دیا ہے۔ ہندوستان بھر میں اک آگ سی پھیلی ہوئی ہے۔ اور یہ بدامنی ہمیں جاپانیوں کا مقابلہ کرنے سے روک رہی ہے۔

عین اسی وقت زور سے بگل بجنے کی آواز آئی، اور بہت سی گھوڑوں کی چاپ، انگریز گھڑ سواروں کا اک قافلہ ہماری بالکونی کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ یہ لوگ پستولوں اور رائفلوں سے مسلح تھے۔ آگے آگے دو انگریز بگل بجا رہے تھے۔

یہ قافلہ بالکونی کے نیچے سے گزرتا ہوا اگاف کورس کی طرف چلا گیا۔

میں نے کہا "بداعتمادی سے بداعتمادی پیدا ہوتی ہے یہ زندگی کا اصول ہے، انگریزوں کو ہندوستانیوں کی جمہوریت پسندی پر اعتماد نہیں۔ اور ہندوستانیوں کو انگریزوں کی ہمدردی اور داد رسی پر۔ اب دیکھئے۔ یہاں گلمرگ میں کوئی فساد نہیں، لیکن یہاں بھی یہ لوگ ہر روز انگوگشت کرتے ہیں، اور ایک بنگلے سے دوسرے بنگلے تک گھومتے ہوئے سارے گلمرگ کا چکر لگاتے ہیں مبادا کہیں کوئی کانگرسی بم پھینک دے۔

سرکلر روڈ کی سمت سے وہ نوجوان جوڑا چلا آرہا تھا۔ چاندنی میں شرابور۔ دل آسودہ، امنگوں سے لبریز۔ نچلی منزل میں مس جائس جو لنکا شائر کی رہنے والی تھی، نہایت اُداس سروں میں اپنے وطن کا اک دیہاتی گیت گا رہی تھی اُس کا نیا یار شرابی لہجے میں بار بار کہہ رہا تھا "ڈارلنگ میں بھی لنکا شائر کا رہنے والا ہوں۔ ڈارلنگ میں بھی لنکا شائر کا رہنے والا ہوں۔"

چاندنی میں نہائے ہوئے بُتِ سیمیں کو اپنی آغوش میں لیکر نوجوان لڑکا سڑک پر کھڑا ہو کر دہیں اپنی بیوی کو چومنے لگا۔

نچلی منزل پر یکایک نرس رونے لگی۔ "میں گھر جانا چاہتی ہوں۔ ڈارلنگ بلائے

میں گھر جانا چاہتی ہوں۔"

اوبرائن کہنے لگا۔" انسان ابھی جغرافیائی عشق سے آزاد نہیں ہوا۔ گاندھی ہندوستانی ہے۔ اُسے ہندوستان سے عشق ہے۔ یہ نرس لنکا شائر کی رہنے والی ہے اسے لنکا شائر سے عشق ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے۔ کہ گلمرگ کے مقابلے میں لنکا شائر بالکل ......" وہ سر ہلا کر چپ ہو گیا۔

میں نے کہا۔ پرسوں بگّی مل کی دکان پر میری ملاقات ایک انگریز درزن سے ہوئی، وہ انگلستان کی لیبر پارٹی کی ممبر تھی، وہ بھی تمہاری طرح گاندھی کو بُرا بھلا کہہ رہی تھی، کہتی تھی کہ اب گلمرگ میں بھی فساد ہوگا، اور یہی لوگ جو آج ہمارے پاس شہد، ڈبل روٹی، اور شلغم بیچنے کے لئے آتے ہیں، ہم پر چھروں اور لاٹھیوں سے حملہ کریں گے، پھر وہ مسکرا کر کہنے لگی، یہ بہتر ہے کہ میں اُن لوگوں کے ہاتھوں ماری جاؤں جو مجھے جانتے ہیں۔ مجھے اجنبیوں کے ہاتھوں سے مرنا پسند نہیں۔

اوبرائن بولا۔" تم نے اُس کی طنز کا ملاحظہ کیا؟"

میں نے کہا۔" یہ طنز سراسر غلط تھی۔ گاندھی کسی انگریز کو قتل کرنا نہیں چاہتا، اور پھر اس انگریز درزن کو جو لیبر پارٹی کی ممبر بھی تھی۔ ہندوستانیوں سے

اس قدر خوف کیوں محسوس ہو رہا تھا، یہ آتنی بداعتمادی کس لئے، تمہارے خیال میں کیا اس میں رتی بھر احساس گناہ شامل نہ تھا؟

نیچے نرس اب زور زور سے چلا رہی تھی "میں لنکا شائر جانا چاہتی ہوں، سلی بوائے، میں لنکا شائر جانا چاہتی ہوں، سلی بوائے.....''

اور پراتن مسکرا کر کہنے لگا..... "اور یہی گاندھی چاہتا ہے۔

یکایک عبداللہ کا لڑکا غریب بھاگتا ہوا آیا۔ اور چھوٹتے ہی بولا "بابو جی بابوجی! ابا کو کچھ ہو گیا ہے۔ ابھی چنگے بھلے تھے۔ بیٹھے حقہ پی رہے تھے، پھر کھانسنے لگے اور اک دم چپ ہو گئے، میں نے کہا۔ ابا۔ ابا، وہ نہیں بولے وہ بولتے ہی نہیں بابو جی....." میں بھاگا بھاگا نیچے گیا، عبداللہ اپنی کوٹھڑی میں مرا پڑا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں اوپر چڑھ گئی تھیں، سپنوں کا انتظار کرتے کرتے، ہائے کتنی ناامیدی تھی اُن آنکھوں میں، یہ سپنے کبھی پورے نہیں ہوتے

منیجر دروازے تک بھاگا ہوا آیا۔ اُس نے عبداللہ یا میری طرف دیکھا تک نہیں، غریب کو دیکھ کر بولا "منیجر صاحب کے لئے پانی — گرم پانی چاہیئے جلدی ٹب بھر دو۔"

اور وہ بھاگتا ہوا واپس چلا گیا۔

غریب نے قاعدہ زمین پہ رکھ دیا، اور بالٹی اٹھانے لگا۔

"میرے ابا کو جگا دیجئے" اُس نے مایوسانہ لہجے میں نہایت لجاجت سے کہا۔ "میں میجر صاحب کے لئے پانی رکھ آؤں۔"

قریب کسی کمرے سے آواز آ رہی تھی۔ لنکا شائر کی رہنے والی نرس کو اُس کا نیا یار چوم رہا تھا۔ اور اُسے مخصوص شرابی لہجے میں دلاسا دیتے ہوئے کہہ رہا تھا، میں تجھے لنکا شائر لے جاؤنگا۔ مک یو مائی بے بی۔ میں تجھے لنکا شائر لے جاؤنگا، مک یو سویٹ"

عبداللہ آج ہی کیوں مرا، ایسی خوبصورت چاندنی رات میں، وہ نوجوان لڑکا اور لڑکی ابھی تک گل مرگ کی چاندنی میں نہا رہے تھے، ہواؤں میں جنگلی پھولوں کی مہک بسی ہوئی تھی، کیا عبداللہ آج سے چند سال بعد نہ مر سکتا تھا شاید اُس کا بیٹا پڑھ لکھ کر اُس کے تخیّل کے سپنے سچے کر دیتا، یعنی یہ کون سا طریقہ ہے مرنے کا۔ کہ صاحب لوگوں کے لئے پانی کی بالٹیاں بھرتے بھرتے مر گیا، کیا وہ اپنے کھیتوں میں، اپنے چھوٹے سے باغیچے میں، اپنے مٹی کے گھر میں نہ مر سکتا تھا۔ میں پوچھتا ہوں۔ یہ کیسا مذاق ہے؟ اُسے اس طرح مرنے کا کیا حق تھا، وہ اس طرح کیوں فاقے کرتے کرتے، ایڑیاں رگڑتے رگڑتے

جھوٹے سپنے دیکھتے دیکھتے مرگیا، دنیا میں یہ لاکھوں، کروڑوں عبداللہ شب و روز اس طرح کیوں مرتے ہیں؟ کیوں جیتے ہیں؟ کیوں رہتے ہیں؟ یہ کیا مذاق ہے کیسا تماشا ہے، کیسی خدائی ہے؟

"عبداللہ، ابے سؤر کے بچے، میجر صاحب پانی مانگ رہے ہیں" منیجر کہیں دُور سے چلّایا۔ بول۔ بول۔ اے سؤر کے بچے، سپید سپید پتلیوں والے غلیظ بڈھے، گنجی چاند والے، کھردرے ہات پاؤں والے، نیم برہنہ فاقہ مست انسان، بول! کیا مر کر بھی تجھے گالی کا جواب دینا نہ آئے گا۔

فردوس میں دیکھے ہوئے کچھ عجیب سے چہرے یاد آرہے ہیں، ایک سکھ اور اُس کی خوبصورت بیوی جو گلمرگ دیکھنے آئے تھے۔ اور اس لئے وہ واپس چلے گئے کہ گل مرگ میں پہاڑ کے سوائے اور کچھ نہ تھا۔ سردار کی بیوی ٹھوڑی پہ انگلی رکھ کر بڑے نخرے سے کہنے لگی۔ "اے ہے، یہاں ہے کیا؟ بس پہاڑ ہی پہاڑ ہیں، مجھے تو کشمیر ذرا بھی اچھا نہ لگا۔ بس یہاں ہے کیا، پہاڑ سی پہاڑ ہیں!"

گلیوں کے کتے!

ایک بوڑھا پنشن یافتہ وزیر، اور اُس کے ساتھ ایک غریب انگریز پادری۔

پادری فوج میں ملازم تھا۔ سرکاری فوج میں عیسائیت کا مبلغ، پھر بھی یہ احساس کمتری اُسے کھائے جاتا تھا کہ ہائے وہ پادری ہے، کاش وہ تجارہ، سپاہی، ایکٹر، یا منسٹر کیوں نہیں، پادری کتنی بیچارگی تھی اُن آنکھوں میں، وہ پریشان کھوئی کھوئی آنکھیں۔

بوڑھا وزیر ہر وقت اپنے بڑے لڑکے کا ذکر کرتا جو سکاٹ لینڈ میں تھا اور ہندوستانی ہوتے ہوئے بھی ایک سکاچ کے گھر پرورش پا رہا تھا۔ بوڑھا وزیر بڑے فخر سے اس امر کو بار بار ہوٹل کے ملاقاتیوں کے سامنے دہراتا۔

جمال میرا بیٹا ہے۔ جمال سکاٹ لینڈ میں ہے، جمال میرا بیٹا۔ جمال سکاٹ لینڈ میں ہے، اس کے علاوہ اس میں ایک اور بُری عادت بھی تھی۔ وہ میری بالکونی میں مجھ سے اجازت لئے بغیر آبیٹھتا۔ اور پھر میرا باتھ روم بھی استعمال میں لے آتا۔ جو بالکونی سے کچھ فاصلے پر ہی تھا۔ ایک دن میں نے چڑ کر کہا "صاحب آپ یہ بالکونی اور یہ باتھ روم میری اجازت کے بغیر استعمال نہیں کر سکتے۔"

"کیوں؟" اُس نے بے حد ناراض ہو کر پوچھا۔

اِس لئے کہ جمال آپ کا لڑکا ہے۔ اور جمال سکاٹ لینڈ میں ہے۔ اور

جب تک وہ ذات شریف یہاں تشریف لائیں، میں آپ کو آپ کے پادری دوست سمیت اس بالکونی سے نیچے پھینک دینے کا خوفناک ارادہ رکھتا ہوں۔

لیکن آپ مجھے نہیں جانتے، اُس نے اور بھی برافروختہ ہو کر کہا۔ یہاں کے سب لوگ۔ سب بڑے بڑے لوگ میرے دوست ہیں۔ میں منسٹر رہ چکا ہوں اور دائسرائے بہادر کا مہمان بھی، میں آپ کو جیل بھجوا سکتا ہوں، آپ کس سے بات کر رہے ہیں، میرا لڑکا جمال سکاٹ لینڈ میں ہے۔"

میں نے تہدیدی انداز میں اُسے گھونسا دکھاتے ہوئے کہا۔ "بہتر ہو گا کہ آپ بھی سکاٹ لینڈ تشریف لے جائیں۔ کم از کم بالکونی کی طرف تشریف نہ لائیں۔ ورنہ ——

پانچ چھ تماشہ دیکھنے والے ملاقاتی اکٹھے ہو گئے، آپ نے اُن کی طرف مڑتے ہوئے کہا، واہ یہ بھی کوئی بات ہے، میری اس طرح کوئی بے عزتی کرے۔ میں پنشن یافتہ منسٹر ہوں، میرا لڑکا جمال سکاٹ لینڈ میں ہے اور......

پادری اُسے گھسیٹ کر پرے لے گیا۔

ایک ہندوستانی لڑکی آئی تھی۔ کمرہ نمبر بیالیس میں آ کر رہی، نہ وہ ایکٹرس معلوم ہوتی تھی۔ نہ ہیڈ مسٹرس، نہ طوائف، نہ شادی شدہ خاتون، لیکن پھر بھی اکیلی

آتی تھی اور جتنے دن گل مرگ میں رہی اکیلی رہی، اور اکیلی واپس گئی۔
اوبرائن کہنے لگا، اس لڑکی کو دیکھ کر میرے دل میں اپنی محبوبہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ بالکونی کے منظر نے مجھے اُس سے بھی متعارف ہونے کا موقعہ دیا۔ اوبرائن نے پوچھا۔ کیا آپ پچھلے جنم میں کسی آئرش خاندان میں پیدا ہوئی تھیں
اُس نے نہایت سادگی سے جواب دیا۔ "مجھے یاد نہیں"
ہائے کیا بھولپن تھا، کتنی پیاری معصومیت تھی۔ اوبرائن کا بُرا حال ہو گیا۔ کہنے لگا "ہو نہو۔ یہ وہی ہے، مجھے دھوکا دینے کے لئے ہندوستانی لڑکی کے بہروپ میں آئی ہے۔ چند روز اور یہاں رہی، تو میں مر جاؤنگا۔ میرا سارا فلسفہ ختم ہو جائیگا..... مجھے یاد نہیں۔ ہائے۔ ہائے..."
خیریت ہوئی کہ چند روز کے بعد وہ واپس چلی گئی۔

بالکونی میں ایک سہانی دوپہر لطیف، خنک دھوپ، پلیٹوں میں سیب اور مصری آلوچے، میریا کی سنہری باہیں اور پھول کی کلیوں کی طرح نازک انگلیاں..... میریا کہنے لگی۔ وہ پک نک تمہیں یاد ہے، ہم دونوں نے فیروز پور کے نالے میں سے مچھلیاں پکڑنے کی ناکام کوشش کی تھی....؟

اور Fisheries کے محکمے کے ایک کارکن نے ہمیں بلا اجازت مچھلیاں پکڑنے پر گرفتار کرنا چاہا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

اُم..... اُم..... اُس نے ایک اور آلوچہ اٹھاتے ہوئے کہا میرا مطلب ہے کہ وہ پک نِک بُری تو نہ تھی اب پھر کبھی چلو، اب کے ہم Fisheries کے محکمے سے اجازت بھی لے لیں گے۔"

میں نے کہا۔ مجھے تو اس پک نک میں صرف اخروٹوں کا نالہ پسند آیا تھا اور بیدِ مجنوں کا جھنڈ جہاں نالے کا پانی بھی سویا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اور بیدِ مجنوں کی شاخیں پانی پہ جھکی تھیں۔

"اور چنار کے پتوں کا رنگ شرابی تھا۔" میریا نے خوابیدہ لہجے میں کہا۔

"بالکل تمہارے ہونٹوں کی طرح۔" میں نے شوخی سے کہا۔

"بچے ہو۔ بس مٹھائی دیکھ کر للچا جاتے ہو۔ تمہیں تو عشق کرنا آتا نہیں" میریا نے اِک سنجیدہ تبسم کے ساتھ کہا۔ "شاید اسی لئے تم مجھے اس قدر پسند ہو۔"

بہت دیر تک خاموشی رہی۔ میں اپنی کھال سہلاتا رہا۔

"پھر" ——— وہ بولی۔ "جنگ کے بعد میں اپنے وطن واپس چلی جاؤنگی وہاں اشتراکی پارٹی میں شامل ہوکر سیاسی کام کرونگی، پیانو بجانے سے کام نہ چلے گا، یہ کمبخت جنگ ختم ہوجائے، پھر ہم سب مل کر پوری کوشش کریں گے، کہ جنگ دوبارہ نہ ہو، کیوں ٹھیک ہے نا!"

میں نے کہا۔ "مجھے بھی ساتھ لینی چلو گی؟"

"ضرور"۔ وہ مسرت بھرے لہجے میں بولی۔ ہمارا گاؤں لومبارڈی میں ہے۔ وہاں انگور کی بیلیں ہیں اور شہتوت کے درخت اور کھیتوں کے کنارے کنارے لائم کے پیڑ، تب تک میرا بھائی بھی آزاد ہوجائیگا۔ پھر ہم سب مل کر کھیت بوئیں گے، اور ریشم کے کوئے اکٹھے کریں گے۔ اور پاپا کو ایک اونچی سی کرسی پر بٹھا کر اصل اطالوی شراب پلائیں گے۔ اور کبھی ——— کبھی ——— جنگ نہ ہونے دیں گے . . . . ."

دوسرے دن میریا اور اُس کے باپ کو پولیس نے پھر حراست میں لے لیا، یہ گرفتاری بطور حفظِ ماتقدم عمل میں لائی گئی تھی۔ جنگ آخر جنگ ہے اور فی زمانہ اشتراکی اطالویوں اور فسطائی اطالویوں میں تمیز کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے، اور گو حکام کو ان دونوں افراد پر شبہ نہ تھا۔ پھر بھی احتیاط

لازم تھی۔

چلتے وقت میریا کے باپ نے مجھے ایک چھڑی بطور تحفہ پیش کی۔

میریا نے ایک حزیں مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "اور میں تمہیں کیا دوں۔ نا بخت چوزے"!

میں نے پیانو کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "میں تم سے نغمۂ بہار سننا چاہتا ہوں۔ بے تہوؤن کا نغمہ بہار۔ میرا یقین ہے کہ بہار ضرور آئے گی۔۔۔"

وہ پیانو پر نغمۂ بہار بجانے لگی، اُس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے، اور نغمے کی پہنائیوں میں خوش الحان طیور چہچہانے لگے، پھولوں بھری ڈالیاں لہرانے لگیں، شہتوت کے پتے خوشی سے ناچنے لگے، بلبل کے نغمے، اور عورتوں کے مسرت بھرے قہقہے، اور بے فکر بچوں کی معصوم شوخیاں

بہار۔۔۔۔ بہار۔۔۔۔ بہار۔۔۔۔۔!!!

میریا کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔

بہار ضرور آئیگی، اکدن انسان کی اُجڑی کائنات میں بہار ضرور آئیگی۔ یہ نغمہ کہہ رہا ہے، میریا، ترے آنسو بے کار نہ جائیں گے!

ہماری معیاری مطبوعات

شاعری	دیوان غالب (مصورہ حنیف رامے)	غالب
	آہنگ	اسرار الحق مجاز
	۱۹۴۸ء کا شعری ادب	مرتبہ: ظہیر کاشمیری
	اندھیر نگری	شاد عارفی
	گلافتاب	ظفر اقبال
	گماں کا ممکن	ن۔م۔ راشد
	شب رفتہ	مجید امجد
	شبستان	شکیل بدایونی
	رنگینیاں	شکیل بدایونی
	دل دریا (پنجابی)	عبدالمجید بھٹی
	پھٹا ہوا بادبان	عبدالرشید
	شبنمستان	فراق گورکھپوری
	روح انیس	میر انیس
	آدھے سیارے پر	ثروت حسین
ڈرامے	شکنتلا	کالی داس
خطوط	زیر لب	صفیہ اختر
	حرف آشنا	صفیہ اختر
تاریخ و سوانح	حیات حافظؒ	حافظ محمد اسلم جیراجپوری
	منٹو: میرا دشمن	اوپندر ناتھ اشک
	کمپنی کی حکومت	باری
	کارل مارکس	باری